فہرست

شذرات	استحکام پاکستان	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۵۹-۲۶۰)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	نزول وحی کی کیفیت	زاویۂ فراہی	۱۱
	زندہ در گور کا انجام	طالب محسن	۱۵
دین و دانش	قانون عبادات (۳)	جاوید احمد غامدی	۱۹
حالات و وقائع	عروج و زوال کا قانون (۷)	ریحان احمد یوسفی	۲۷
	عراق پر حملہ	رابرٹ سی بائرڈ/ کاشف علی خان	۵۷
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	وسیم اختر مفتی۔ ریحان احمد یوسفی	۶۳
تبصرۂ کتب	''تصویر کا مسئلہ''	نعیم احمد بلوچ	۶۷
ادبیات	سورۂ تین کی منظوم ترجمانی	مرزا آصف رسول	۷۰

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

استحکام پاکستان

۱۹۴۷ء میں ہم نے سوچا تھا کہ ہم کرۂ ارض پر ایک ایسی سلطنت قائم کر رہے ہیں جہاں اسلام اپنے پورے فلسفے اور قانون کے ساتھ نافذ العمل ہوگا۔ چشم عالم ایک مرتبہ پھر اس عدل اجتماعی کا نظارہ کرے گی جو چودہ صدیاں پہلے خلافت راشدہ کی صورت میں ظہور پزیر ہوا تھا۔ اس کا وجود ملت اسلامیہ کے لیے مرکزی ادارے کا کردار ادا کرے گا اور غیر مسلم دنیا کے لیے اسلام کی مشہود دعوت قرار پائے گا۔ اس کے حدود میں مسلمانوں کی ترقی کی راہیں کسی دوسری قوم کے تعصب سے مسدود نہیں ہوں گی۔ وہ باہم متحد ہو کر اسے اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیں گے اور دیگر مسلمانان عالم کے لیے سہارے اور تعاون کا باعث ہوں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم ایک ایسی ریاست تشکیل دے رہے ہیں جو دور جدید میں فلاحی ریاست کے تمام تر تصورات کی آئینہ دار ہوگی۔ جہاں تفریق و امتیاز کے بغیر شہریوں کو ان کے حقوق میسر ہوں گے اور لوگ یکساں طور پر تعلیم، روزگار، صحت اور امن عامہ کی سہولتوں سے بہرہ مند ہوں گے۔ ہمارا تصور تھا کہ ہم ایک ایسا ملک معرض وجود میں لا رہے ہیں جس کا نظم سیاسی جمہوری اقدار پر مبنی ہوگا۔ اس کے عوام اپنا اجتماعی نظام خود تشکیل دیں گے اور انھیں اس میں تبدیلی کرنے اور اپنے حکمرانوں کے تقرر و تنزل کا پورا اختیار حاصل ہوگا۔

آج پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کا وجود سلامت ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے خواب آج بھی تشنۂ تعبیر ہیں۔ اسلام کا عدل اجتماعی اور خلافت راشدہ تو افلاک کی باتیں ہیں، ہم ان ارضی اخلاقیات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکے جو دنیا میں متفق علیہ ہیں اور جن پر اسلام سے نابلد اقوام بھی صدیوں سے عمل پیرا ہیں۔ یہ سلطنت اسلام کی تجربہ گاہ اور پھر اس کا مشہود نمونہ تو کیا بنتی، اسلام کی حیثیت عرفی کو مجروح کرنے کا باعث ضرور ہوئی ہے۔ اس کے مکینوں نے اپنے قول و عمل سے اسلام کا جو تعارف پیش کیا ہے، اس کی روشنی میں اہل دنیا اسے ایک متشدد، غیر عقلی، جذباتی اور عصر حاضر سے غیر ہم آہنگ مذہب تصور کرتے ہیں۔ فلاحی ریاست کے تمام تصورات بکھر چکے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔غربت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ملکی معیشت دن بہ دن رو بہ زوال ہے۔ بیشتر آبادی کے لیے دو وقت کے کھانے کا حصول مشکل ہوتا جا رہا ہے۔تعلیمی پس ماندگی کا یہ عالم ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد ملازمت کا حصول بن گیا ہے۔درس گاہوں کی حالت یہ ہے کہ فلسفہ، ادب، تاریخ، عمرانیات، اقتصادیات، ریاضی، سائنس، آرٹ اور دیگر علوم وفنون کے وہ نصابات جن سے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کئی عشرے پہلے گزر کر انھیں متروک قرار دے چکی ہیں، وہ ان میں کسب فیض کا ذریعہ ہیں۔لوگوں کی اکثریت کو صحت کی ابتدائی ضرورتیں بھی میسر نہیں ہیں۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ فلاحی ریاست کے حوالے سے ہمارا سفر آج بھی اتنا ہی باقی ہے جتنا آج سے پچاس سال پہلے تھا۔ جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ ہم شاید چند دنوں کے لیے بھی اس کا تجربہ نہیں کر سکے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہماری جمہوری سیاست محض مفادات کی سیاست واقع ہوئی ہے۔

یہ حال ہے جو ہمارے خوابوں اور ہمارے تصورات کا ہوا ہے۔ ہمارے اجتماعی وجود کی یہ حالت اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔البتہ، یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا سبب کیا ہے؟ کیا یہاں افرادی وسائل کی کمی ہے، کیا یہاں بے صلاحیت لوگ بستے ہیں، کیا یہاں کے لوگوں کو نفاذ اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیا یہاں کے باشندے اپنی اور ملک کی ترقی کی خواہش سے محروم ہیں، کیا یہاں کے شہری نظم سیاسی کو اپنی منشا کے مطابق چلانے کی تمنا نہیں رکھتے ؟ یا پھر یہ خطۂ ارضی آفات سماوی کا شکار ہے، یا اس کی سرزمین قدرتی وسائل سے خالی ہے؟ ان سوالوں کے جواب میں ہر شخص کہے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ ملک افرادی وسائل سے مالا مال ہے۔قدرتی وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔اس سرزمین میں زراعت اور معدنیات کے حوالے سے ایسا تنوع اور تناسب پایا جاتا ہے کہ دنیا کے کم ممالک ایسی تقسیم کے حامل ہیں۔اس کے باسی صلاحیت اور جاں فشانی میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مسلسل جدوجہد سے ایک ایسے ملک کو قائم کیا جسے دنیا ناممکن قرار دے رہی تھی۔ ملک وملت کی بقا کے لیے جب بھی کسی نے صدا لگائی ہے، اس کے افراد نے اپنی جانیں تک پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔جمہوریت کے نعرے پر ہمیشہ لبیک کہا ہے۔اسلام سے محبت کا یہ عالم رہا ہے کہ اگر کسی طالع آزما نے بھی اسلام کا نعرہ لگایا تو اس پر بھی لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔

اگر معاملہ یہ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ۵۷ برس گزرنے کے باوجود ہم منزل تک رسائی تو کیا حاصل کرتے، نشانات منزل ہی کھو بیٹھے ہیں۔اس تمام صورت حال کا صرف ایک سبب ہے اور وہ دینی اور دنیوی امور میں ہماری جہالت ہے۔

ہم اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دین کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔اس جہالت کا عالم یہ ہے کہ ہمارے عوام کا تصور دین مخصوص مکاتب فکر کی فقہی آرا کی پیروی تک محدود ہے۔کہیں کلمات نماز کے بلند آہنگ یا کم آہنگ ہونے کا مسئلہ ہے، کہیں ازار کے ٹخنوں سے اوپر یا نیچے ہونے کا معاملہ ہے، کہیں داڑھی کے لمبا یا چھوٹا ہونے کا سوال ہے، کہیں عمامے اور ٹوپی کی جنگ ہے۔خواص کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی غلط تعبیرات سامنے آنے کی وجہ سے اسے ایک

قصۂ پارینہ سمجھ کر دور جدید کے تقاضوں سے غیر ہم آہنگ قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک علماے دین کا تعلق ہے تو ان کی اکثریت لوگوں کو سرگرم جنگ رکھنے پر مصر ہے۔ انھوں نے اس دوران میں کبھی اس کے لیے کوشش نہیں کی کہ لوگوں کو دین کے حقیقی شعور سے آگاہ کریں، ان کی اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں اور انھیں حالات کے لحاظ سے حکمت عملی ترتیب دینے کی ترغیب دیں۔ اس زمانے میں بالخصوص ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اسلام کے بارے میں جدید ذہن کے سوالات کا جائزہ لیتے اور عصر حاضر کے اسلوب میں ان کے تسلی بخش جوابات مرتب کرتے۔ المیہ یہ ہے کہ انھوں نے اس میدان میں علمی و فکری کام کرنے کے بجائے اپنی تمام تر توجہ سیاست کی حریفانہ کشمکش اور معاندانہ قوتوں کے خلاف جذباتی فضا قائم کرنے پر مرتکز رکھی ہے۔

اگر ہم اسے ایک فلاحی ریاست نہیں بنا سکے تو اس کی وجہ دنیوی امور کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ اپنے افراد کی عمومی تعلیم کے بارے میں ہم نے ہمیشہ غفلت اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے تمام طبقات بلا استثنا جہالت کا شکار ہیں۔ فلاحی ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ معاشرے کا اجتماعی نظام عادل، شفاف اور زندگی کی سہولتوں سے آراستہ ہو۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہم نے کبھی منصوبہ بندی نہیں کی۔ معاشرے کی ترقی کے لیے کن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے، قانون پسندی کی کیا اہمیت ہے، اعلیٰ انسانی اقدار کس طرح اداروں میں ڈھلتی ہیں، رفاہی ادارے کس طریقے سے خدمت انجام دیتے ہیں، شہریوں کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، ارباب حکومت کو کیا فرائض انجام دینے ہوتے ہیں، صحت، تعلیم اور روزگار کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے حکومت کو کیا منصوبہ بندی کرنا ہوتی ہے اور عوام کیسے اس عمل میں شریک ہوتے ہیں، امن عامہ کے مسائل کو کیسے حل کیا جاتا ہے، ظلم و عدوان کے خاتمے اور عدل و انصاف کے قیام کے لیے کیسے لائحۂ عمل تشکیل دیا جاتا ہے؟ یہ مسائل ہمارے فکر و عمل کا کبھی حصہ نہیں بن سکے۔ اس زمانے میں کسی قوم کی مادی ترقی کا انحصار سر تا سر اس بات پر ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ دفاع، صنعت، زراعت اور رسل و رسائل کے معاملات میں سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کی بنیاد پر ترقی کی جا سکتی ہے۔ مگر ہماری حالت اس میدان میں نہایت ابتر ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ہماری غربت کا اصل سبب جدید سائنسی علوم سے بے اعتنائی ہے۔ فلاحی ریاست کا تصور امن عامہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کے قیام کے لیے ضروری تھا کہ ہم عام اخلاقیات کے شعور سے بہرہ مند ہوں۔ ہماری تربیت ہونی چاہیے تھی کہ ایک شہری کی حیثیت سے ہماری کیا ذمہ داریاں ہیں، دوسروں کے حقوق کس طرح ادا کیے جاتے ہیں، قانون کی پاس داری کے فوائد اور قانون شکنی کے کیا نقصانات ہیں، دھوکا، فریب، عناد، ہٹ دھرمی اور حق تلفی سے کس طرح انسانی شخصیات مسخ ہوتی اور پورے معاشرے کے لیے امن و امان کا مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ ان پہلوؤں سے ہم آج تک نہ اپنی تربیت کر سکے اور نہ اس مقصد کے لیے کوئی لائحۂ عمل تشکیل دے سکے ہیں۔

اگر ہم یہاں جمہوری اقدار کو مستحکم نہیں کر سکے تو اس کی وجہ سیاسی معاملات کے بارے میں ہماری جہالت ہے۔ ہمارے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عوام کی اکثریت سیاسی شعور سے بے گانہ ہے۔ جمہوریت عوام کی سیاسی عمل میں بھرپور شرکت کا نام ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کے افراد باہمی مشاورت سے اپنی ضرورتوں کا تعین کرتے، انھیں پورا کرنے کے لیے لائحۂ عمل تشکیل دیتے، اپنی تنظیم کرتے، تقسیم کار کے اصول پر اپنی ذمہ داریاں بانٹتے، اس مقصد کے لیے ادارے اور انجمنیں تشکیل دیتے اور پوری تن دہی کے ساتھ ملکی تعمیر میں سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔قوم کا ہر فرد اس کام میں پورے شعور کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارا معاملہ یہ ہے کار پرداز عناصر عوام کو فریب دیتے اور عوام بڑی آسانی سے ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ جس فرد یا گروہ کے ہاتھ میں اقتدار آتا ہے، وہ اس پر بالجبر قابض رہنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے جمہوری اداروں کی پامالی کی پروا بھی نہیں کرتا۔ ایسے موقعوں پر عوام نہ موثر احتجاج کر پاتے اور نہ تبدیلی حالات کے لیے صحیح خطوط پر کوئی جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا کہ جمہوری ادارے بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں اور ملک پر سیاسی عدم استحکام کی فضا طاری رہتی ہے۔

اس تناظر میں ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے واحد راستہ تعلیم ہے۔ جب تک ہم دینی و دنیوی اعتبار سے اپنی جہالت سے چھٹکارا نہیں پا لیتے اور اس حقیقت کا ادراک نہیں کر لیتے کہ موجودہ زمانے میں تعلیم و تعلم ہی سے ترقی کے منازل طے کیے جا سکتے ہیں، اس وقت تک ہمارا یہ خواب، خواب ہی رہے گا۔

ـــــ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۵۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ، وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا، قَالَ: اَنّٰى يُحْيٖ

یا اُس[۶۸۸] شخص کی مثال ہے[۶۸۹] جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی[۶۹۰]۔ اُس نے حیرت

[۶۸۸] پہلی مثال شیاطین کے اندھیروں کی طرف نکال لے جانے کی تھی۔ اب یہ اُن لوگوں کی مثال بیان ہو رہی ہے جنھیں اُن کا پروردگار اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا ہے۔

[۶۸۹] یہ غالباً حزقی ایل نبی کے اُن مشاہدات میں سے ہے جو بنی اسرائیل میں دعوت و اصلاح اور اُن کے احیا کی جدوجہد کے لیے اٹھنے سے پہلے اُنھیں کرائے گئے۔ بائیبل میں اُن کا اِسی نوعیت کا ایک مشاہدہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اُس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اُس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے اُن کے آس پاس چوگرد پھرایا، اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں، اور اُس نے مجھے فرمایا: اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا: اے خداوند خدا، تو ہی جانتا ہے۔ پھر اُس نے مجھے فرمایا: تو اِن ہڈیوں پر نبوت کر اور اُن سے کہہ: اے سوکھی ہڈیو، خداوند کا کلام سنو: خداوند خدا اِن ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمھارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی، اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی، اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ، زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں، ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت اُن پر چڑھ آئے اور اُن پر چمڑے کی پوشش ہو گئی، پر اُن میں دم نہ تھا۔ تب اُس نے مجھے فرمایا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا، فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ، ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ: كَمْ لَبِثْتَ؟ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ. قَالَ: بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ، فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ، وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ، وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ، وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا، ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ، قَالَ: اَعْلَمُ اَنَّ

سے کہا: اِس طرح فنا ہو جانے کے بعد اللہ اِسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا؟[۶۹۱] اِس پر اللہ نے اُسے سو سال کی موت دی، پھر اُٹھایا۔ (وہ اٹھا تو) پوچھا: کتنی مدت پڑے رہے؟ اُس نے جواب دیا: ایک دن یا اُس سے کچھ کم۔ فرمایا: نہیں، بلکہ سو سال اِسی حالت میں تم پر گزر گئے۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو، اِن میں سے کوئی چیز سڑی نہیں۔ (دوسری طرف) ذرا اپنے گدھے کو دیکھو (کہ ہم اُس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں، اِس لیے کہ تمھیں اِس بستی کے اٹھائے جانے پر یقین ہو) اور اِس لیے کہ ہم لوگوں کے لیے تمھیں (امید کی) ایک نشانی بنا دیں[۶۹۲]، اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، ہم کس طریقے سے اُن کو اٹھاتے اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ اِس طرح جب حقیقت اُس پر واضح ہو گئی تو وہ پکار اٹھا کہ (اب کوئی تردد

نبوت کر، اے آدم زاد، اور ہوا سے کہہ کہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دم، تو چاروں طرف سے آ اور اِن مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور اُن میں دم آیا اور وہ زندہ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں، ایک نہایت بڑا لشکر۔'' (حزقی ایل ۳۷: ۱-۱۰)

[۶۹۰] اصل الفاظ ہیں: 'وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا'۔ یہ گری ہوئی بستی کی تصویر ہے جس میں چھتوں کے زمین بوس ہو جانے کے بعد دیواریں اُن پر اوندھی پڑی ہوتی ہیں۔

[۶۹۱] یہ کس نوعیت کا سوال ہے؟ استاذ امام اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اُس کا یہ سوال... انکار کی نوعیت کا نہیں، بلکہ اظہار حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے، اِس لیے کہ عقل و فطرت اُس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے، لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اُس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہو گی؟ یہ سوال انکار کے جذبے سے نہیں، بلکہ جستجوے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر اُن مواقع پر زیادہ زور سے ابھرتا ہے جب سامنے کوئی ایسا منظر آ جائے جو باطن کو جھنجھوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں، بلکہ اُس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوک باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالب حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے، اور یہ سفر برابر اُس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک

اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ. ﴿۲۵۹﴾

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ: رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی؟ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟

نہیں رہا)، میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔[۶۹۳] ۲۵۹

اور (اِس سلسلے میں) وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے[۶۹۴]، جب ابراہیم نے کہا تھا کہ پروردگار، مجھے دکھا دیں

'حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ' کے انوار سے قلب ونظر جگمگا نہ جائیں۔ اِس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے، لیکن عارف کی نظر میں اُس کا ہر آج اُس کے گذشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اُس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔'' (تدبرقرآن ۱/۶۰۱)

[۶۹۲] اصل میں 'وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ وَ لِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں 'اُنْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ' کے بعد 'کیف نحییہ' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف ہوگئے ہیں۔ اِسی طرح 'وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ' سے پہلے اِس کا معطوف علیہ حذف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اِسے جس طرح کھولا ہے، اُس سے پوری بات یہ سامنے آتی ہے کہ حزقی ایل نبی کو یہ مشاہدہ کرانے سے مقصود جہاں یہ تھا کہ خود اُنھیں موت کے بعد زندگی کے مسئلے میں شرح صدر حاصل ہو، وہاں یہ بھی تھا کہ اُن کا مشاہدہ بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانی بنے اور اِس کے نتیجے میں اُن کے اندر حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ اُنھیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ صحیفۂ حزقی ایل کی جو عبارت اوپر نقل ہوئی ہے، اُس کا خاتمہ اِن الفاظ پر ہوا ہے:

''تب اُس نے مجھے فرمایا: اے آدم زاد، یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں۔ دیکھ، یہ کہتے ہیں: ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی، ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اِس لیے تو نبوت کر اور اِن سے کہہ: خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو، دیکھو میں تمھاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو اُن سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کے ملک میں لاؤں گا۔ اور اے میرے لوگو، جب میں تمھاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو اُن سے باہر نکالوں گا، تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں۔ اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمھارے ملک میں بساؤں گا، تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا اور پورا کیا، خداوند فرماتا ہے۔'' (۳۷: ۱۱-۱۴)

[۶۹۳] یعنی اِس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ کھانے اور پینے کی چیزیں سو سال پڑی رہیں اور اُن میں کوئی تغیر نہ ہو اور اِس پر بھی کہ گدھے کی ہڈیاں تک سڑ کر بوسیدہ ہو جائیں اور وہ چشم زدن میں اُنھیں اٹھا کر دوبارہ زندگی بخش دے۔

[۶۹۴] یہ اِس بات کی دوسری مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ ماننے والوں کا مددگار ہے اور وہ اپنے اُن بندوں کو شرح صدر اور اطمینان قلب سے محروم نہیں رکھتا جو سچے دل سے اِس کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اُس کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو

قَالَ: بَلٰی، وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ. قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ، فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ، ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا، ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا، وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ. ﴿٢٦٠﴾

کہ آپ مردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: ایمان تو رکھتا ہوں، لیکن خواہش ہے کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: اچھا، تو چار پرندے لو،[٦٩٥] پھر اُن کو اپنے ساتھ ہلا لو، پھر[٦٩٦] (اُن کو ذبح کر کے) ہر پہاڑی پر اُن میں سے ایک ایک کو رکھ دو، پھر اُنھیں پکارو، وہ (زندہ ہو کر) دوڑتے ہوئے تمھارے پاس آ جائیں گے، اور (آیندہ کے لیے) خوب سمجھ لو کہ اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔[٦٩٧] ٢٦٠

اپنے خاص بندوں کے باطن کی کوئی خلش دور کرنے کے لیے وہ اُنھیں اِس طرح کے غیر معمولی مشاہدات بھی کرا دیتا ہے۔

[٦٩٥] یہ ہدایت غالباً اِس لیے ہوئی کہ چار پرندے چاروں سمتوں سے دوڑتے ہوئے آئیں گے تو ابراہیم علیہ السلام کے سامنے گویا صور پھونکنے کے بعد تمام مخلوق کے اِسی طرح ہر سمت سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑنے کی تصویر آ جائے گی۔

[٦٩٦] اِس ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ پرندے زندہ ہو کر آئیں تو سیدنا ابراہیم کو کوئی اشتباہ نہ ہو کہ یہ وہی پرندے ہیں جو اُنھوں نے ذبح کر کے پہاڑی پر رکھے تھے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ قیامت میں اٹھتے ہی دنیوی زندگی کی تمام یادداشتیں آپ سے آپ زندہ ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آوازیں بھی اُسی طرح پہچان لیں گے، جس طرح دنیا میں پہچانتے تھے۔

[٦٩٧] چنانچہ وہ جب چاہے گا، لوگوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا اور وہ لازماً ایسا کرے گا، اِس لیے کہ یہی اُس کی حکمت کا تقاضا بھی ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نزول وحی کی کیفیت

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روٰی[1] ان رجلاً[2] سال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: یا رسول اللّٰہ کیف یاتیک الوحی؟ فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: یاتی الملک احیانا فی مثل صلصلۃ الجرس[3]، وھو اشدہ علی، فیفصم عنی، وقد وعیت عنہ ما قال، واحیانا یتمثل لی الملک رجلا، فیکلمنی[4] فاعی ما یقول، وھو اھونہ[5] علی[6].

قالت عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا: ولقد رایتہ ینزل علیہ الوحی فی الیوم الشدید البرد، فیفصم عنہ، وان جبینہ لیتفصد عرقا.

وقال عبادۃ بن الصامت: کان نبی اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا نزل علیہ الوحی کرب لذلک وتربد وجھہ[7]. وقال ایضا: اذا انزل علیہ الوحی

نکس راسه، و نکس اصحابه رؤوسهم، فلما اتلی عنه رفع راسه[8].

روایت ہوا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ، آپ پر وحی کیسے آتی ہے[1]؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بعض اوقات فرشتہ میرے پاس (کوئی شکل اختیار کیے بغیر) ایسے آتا ہے جیسے گھنٹی کی آواز ہو[2]۔ یہ صورت مجھ پر بہت گراں ہوتی ہے[3]۔ پھر جب مجھے اس کی کہی ہوئی ہر بات یاد ہو جاتی ہے تو وہ مجھ سے الگ ہو جاتا ہے۔ (اس کے برعکس) بعض اوقات فرشتہ انسانی شکل میں آ کر مجھ سے کلام کرتا ہے اور میں اس کی ہر بات یاد کر لیتا ہوں۔ یہ صورت میرے لیے بہت آسان ہوتی ہے۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک نہایت سرد دن میں نزول وحی کی کیفیت دیکھی ہے۔ (اس روز) جب فرشتہ آپ سے الگ ہوا تو (شدید سردی کے باوجود) آپ کی پیشانی سے پسینا ٹپک رہا تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو بہت مشکل محسوس ہوتی اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا[4]۔ عبادہ بن صامت یہ بھی کہتے ہیں: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ اپنا سر جھکا لیتے۔ (پاس ادب میں) صحابہ بھی اپنے سر جھکا لیتے[5]۔ جب وحی کا سلسلہ رک جاتا تو پھر آپ سر اٹھا لیتے۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ اس سوال کا باعث وہ فطری تجسس ہے جو خرق عادت واقعات کے حوالے سے ہر شخص کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ ہر نبی نزول وحی کے تجربے سے تنہا گزرتا ہے۔ دوسرے افراد اس سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایک عام انسانی تجربے سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے۔

۳۔ یہ نزول وحی کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی داخلی کیفیت کا بیان ہے۔ عام آدمی، ظاہر ہے کہ اس کا پوری طرح

ادراک نہیں کرسکتا کہ دشواری کے لحاظ سے وحی کی ایک صورت دوسری سے کیسے مختلف تھی۔

۴۔'ترید' کا لفظ عربی زبان میں عام طور پر رنگ پھیکا پڑ جانے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

۵۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر صحابہ کے درمیان تشریف فرما ہوتے تو آپ اپنی توجہ مجلس سے بالکل منقطع کر لیتے اور اپنا سر جھکا لیتے۔ صحابہ کو بھی یہ اندازہ ہو جاتا کہ اس وقت وحی نازل ہو رہی ہے، چنانچہ وہ بھی پاس ادب کی خاطر اور آپ کی توجہ میں خلل اندازی سے بچنے کے لیے خاموش ہو جاتے اور اپنے سر جھکا لیتے۔

متن کے حواشی

۱۔اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۲ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۳۰۴۳۔ موطا، رقم ۴۷۵۔ مسلم، رقم ۲۳۳۳، ۲۳۳۴، ۲۳۳۵۔ ابن حبان، رقم ۳۸۔ ترمذی، رقم ۳۶۳۴۔ نسائی، رقم ۹۳۳، ۹۳۴۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۷۹۷۴، ۱۱۱۲۸۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۷۰۷، ۲۴۳۵۴، ۲۵۲۹۱، ۲۵۳۴۲، ۲۵۶۹۸، ۲۶۲۴۱، ۲۶۲۴۳۔ بیہقی، رقم ۱۳۱۲۰۔ مسند الحمیدی، رقم ۲۵۶۔

۲۔بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۲ میں سوال پوچھنے والے کا نام حارث بن ہشام نقل ہوا ہے۔

۳۔'یاتی الملك احیانا فی مثل صلصلة الجرس' (بعض اوقات فرشتہ میرے پاس (کوئی شکل اختیار کیے بغیر) ایسے آتا ہے جیسے گھنٹی کی آواز ہو) کا جملہ بخاری، رقم ۳۰۴۳ سے لیا گیا ہے۔ جبکہ بخاری، رقم ۲ میں یہ بات ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے: 'یاتینی مثل صلصلة الجرس' (وہ میرے پاس ایسے آتا ہے جیسے گھنٹی کی آواز ہو)۔

۴۔'یتمثل لی الملك رجلا فیکلمنی' (فرشتہ انسانی شکل میں آ کر مجھ سے کلام کرتا ہے) کے الفاظ روایتوں میں مختلف طریقے سے نقل ہوئے ہیں۔ مثلاً نسائی، رقم ۹۳۳ میں 'یاتینی فی مثل صورة الفتی فینبذه الی' (وہ میرے پاس ایک نوجوان آدمی کی صورت میں آتا ہے اور مجھے (پیغام وحی) پہنچا دیتا ہے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بخاری، رقم ۱۳۱۲۰ میں 'فیکلمنی' (پھر وہ مجھ سے کلام کرتا ہے) کے بجائے 'فیعلمنی' (پھر وہ مجھے سکھاتا ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

۵۔'وھو اھونه علی' (یہ صورت میرے لیے بہت آسان ہوتی ہے) کے الفاظ مسند حمیدی، رقم ۲۵۶ سے لیے گئے ہیں۔

۶۔بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۱۷۰۷ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب اس سے مختلف طریقے پر نقل ہوا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الفاظ یہ ہیں:'اسمع صلاصل ثم اسکت عند ذلك فما من مرة یوحی الی الا ظننت ان نفسی تفیض '(میں گھنٹیوں جیسی آواز سنتا ہوں، پھر میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ جب بھی مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے، تو اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے جان نکل رہی ہو)۔

۷۔'وقال عبادة بن الصامت: کان نبی ...وترید وجهه'(عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو... آپ کا چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا) کا حصہ مسلم، رقم ۲۳۳۴ سے لیا گیا ہے۔

۸۔'اذا انزل... اتلی عنه رفع راسه'(جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو... پھر آپ سر اٹھا لیتے) کا جز مسلم، رقم ۲۳۳۵ سے لیا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

زندہ در گور کا انجام

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث ۱۱۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن ابن مسعود رضی الله عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: الوائدة والموؤدة فی النار.

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زندہ در گور کرنے والی اور زندہ در گور کی جانے والی لڑکی، دونوں جہنم میں جائیں گی۔''

لغوی مباحث

الوائدة: یہ 'وائد' سے اسم فاعل مونث واحد کا صیغہ ہے۔ 'وأد' کے معنی ہیں: اس نے زندہ دفن کر دیا۔

الموؤدة: یہ 'وأد' سے اسم مفعول مونث واحد کا صیغہ ہے۔

متون

صاحب مشکوٰۃ نے پوری روایت کی حیثیت سے ایک جملہ ہی نقل کیا ہے۔ یہ روایت انھوں نے ابوداؤد سے لی ہے اور ابو داؤد میں بھی یہ روایت اسی جملے پر مبنی ہے۔ لیکن مسند احمد اور بعض دوسری کتب میں یہ جملہ ایک مکالمے کے حصے کے طور پر آیا ہے۔ ہم مسند احمد کی پوری روایت یہاں نقل کر رہے ہیں:

عن سلمة بن يزيد الجعفی قال: انطلقت انا واخی الی رسول اللّٰه صلی اللّٰہ علیہ وسلم. قال: قلنا: یارسول اللّٰه ان امنا ملیکة کانت. تصل الرحم وتقری الضیف وتفعل وتفعل. هلکت فی الجاهلیة. فهل ذلك نافعها شیئا؟ قال: لا. قلنا: فانها کانت وادت اختالنا فی الجاهلیة. فهل ذلك نافعها شیئا؟ قال: الوائدة والموء ودة فی النار الا ان تدرك الوائدة الاسلام فیعفعو اللّٰه عنها. (رقم ۲۰۹۸۰)

''سلمہ بن یزید جعفی بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ، ہماری والدہ ملیکہ رشتے داروں کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ مہمان نوازی کرتی تھیں۔ اور یہ اور یہ (نیکیاں) کرتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں فوت ہوگئیں۔ کیا یہ نیکیاں انھیں کچھ فائدہ دیں گی۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ (اس پر) ہم نے پوچھا: پھر ایک معاملہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہماری ایک بہن کو زمانۂ جاہلیت میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ کیا یہ چیز ان کے لیے کچھ نتیجہ پیدا کرے گی۔ آپ نے فرمایا: زندہ دفن کرنے والی اور زندہ دفن کی گئی، دونوں جہنم میں ہوں گی۔ الا یہ کہ زندہ دفن کرنے والی اسلام قبول کر لیتی تو اللہ اس کو معاف کر دیتا۔''

اس تفصیل کو بیان کرنے میں الفاظ کا فرق موجود ہے۔ لیکن کوئی معنوی فرق نہیں ہے۔ ہمیں کوئی ایسا متن نہیں ملا جو 'موؤدة' کے جہنم میں جانے کے سبب کو بیان کرتا ہو۔ قرآن مجید میں 'موؤدة' کو ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور روز قیامت اس سے پوچھا گیا یہ سوال کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی، اس کے بے گناہ ہونے کی طرف صریح اشارہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معنی

عربوں میں بعض خاندانوں میں یہ رواج تھا کہ وہ بچیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اس کے دو اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ بعض عرب خاندان تنگ دستی کے اندیشے سے ایسا کرتے تھے۔ دوسرا یہ کہ وہ ایسا غیرت کے باعث کرتے تھے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ ایسا کرنا ایک شنیع جرم ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک فطری سوال ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والے یا کرنے والی کو کیا سزا ملے گی۔ اسی طرح اس بچی کا کیا انجام ہوگا جسے اس طرح قتل کر دیا جاتا تھا۔

اپنے الفاظ سے یہ روایت اس مضمون کو بیان کرتی ہے کہ نہ صرف ماں، بلکہ وہ بچی بھی جہنم میں جائے گی جسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔ بچی کی ماں کے جہنم میں جانے میں کوئی اشکال اس لیے نہیں ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہونے کے باوجود مذہب شرک

کی حامل تھی اور قرآن مجید سے واضح ہے کہ مشرکین و مشرکات جہنم میں جائیں گے۔

سوال 'موؤدہ' کے حوالے سے ہے کہ اسے کس بنا پر جہنم میں بھیجا جائے گا۔

شارحین نے اس کے دو حل پیش کیے ہیں: ایک یہ کہ یہ روایت کفار کے بارے میں ہے اور اسے اس روایت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے بچوں کے بارے میں یہ وضاحت کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ ہوں گے اور اس پر کیے جانے والے اس سوال پر کہ یہ فیصلہ ان کے کچھ نہ کرنے کے باوجود ہو گا آپ نے یہ بتایا کہ یہ فیصلہ اللہ کے اس علم کی بنیاد پر ہو گا کہ وہ اگر زندہ رہتے تو کیا کرتے۔ یہ روایت زیر بحث آ چکی ہے اور ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ بات قرآن مجید میں بیان کیے گئے اس اصول کے بالکل خلاف ہے کہ ''لیس للانسان الا ما سعی'۔

دوسرا حل یہ ہے کہ انجام کی یہ خبر صرف اسی ماں بیٹی سے متعلق تھی، جن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا۔ اس خبر کو اصول کے طور پر نہیں لینا چاہیے۔ لیکن اس سے کوئی جوہری فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ اعتراض اس صورت میں بھی قائم رہتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 'موؤدہ' کے جہنم میں جانے کی کوئی قابل قبول توجیہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس روایت کے بارے میں یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل الفاظ نقل نہیں ہوئے۔

یہ دونوں حل روایت کے الفاظ کے ایک معنی کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے ہیں۔ ایک حل الفاظ کی ایک مختلف تاویل سے بھی کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق 'الوائدہ' سے مراد دایہ ہے اور 'الموؤدۃ' سے مراد وہ عورت ہے جو بچی کو جنم دینے والی ہے۔ 'الموؤدۃ' کی اس تاویل کے لیے 'موؤدۃ' کے بعد 'لہا' کا صلہ محذوف قرار دیا گیا ہے۔ دایہ اور زچہ کے شریک جرم ہونے کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ ولادت کے موقع پر ایک گڑھا کھودا جاتا تھا۔ دایہ اور زچہ اس کے اوپر بیٹھ جاتی تھیں۔ اگر لڑکا ہوتا تو دایہ اسے سنبھال لیتی اور اگر لڑکی ہوتی تو اسے گڑھے میں گرا دیتی اور اس پر مٹی ڈال دی جاتی۔ دونوں الفاظ کی یہ توجیہ ایک بعید از قیاس توجیہ ہے۔ پوری روایت اس توجیہ کو قبول نہیں کرتی۔ مزید یہ کہ قرآن مجید میں 'موؤدۃ' کا لفظ واضح طور پر زندہ دفن کی جانے والی بچی کے لیے آیا ہے۔

کتابیات

ابوداؤد، رقم ۴۰۹۴۔ مسند احمد، رقم ۱۵۳۵۸۔ ابن حبان، رقم ۷۴۸۰۔ موارد الظمآن، رقم ۶۶۔ السنن الکبریٰ، رقم ۱۱۶۴۹۔ مسند بزاز، رقم ۱۵۹۶، ۱۶۰۵، ۱۸۲۵۔ مسند الشاشی، رقم ۶۴۸۔ المعجم الکبیر، رقم ۶۳۱۹۔

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز کے شرائط

نماز کے لیے جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

نماز پڑھنے والا نشے میں نہ ہو،

وہ اگر عورت ہے تو حیض و نفاس کی حالت میں نہ ہو،

وہ باوضو ہو اور حیض و نفاس یا جنابت[۱] کے بعد اُس نے غسل کر لیا ہو،

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں، یہ دونوں مشکل ہو جائیں تو وہ تیمّم کر لے،

قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو۔

نماز کے لیے یہ چیزیں ہمیشہ ضروری رہی ہیں۔ تاہم عرب کے لوگ چونکہ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد صدیوں تک انبیا علیہم السلام کی ہدایت سے محرومی کے باعث اِس طرح کے بعض معاملات میں متنبہ نہیں رہے تھے، اِس لیے قرآن نے اُن کی تذکیر کے لیے اِن میں سے زیادہ تر چیزیں پوری وضاحت کے ساتھ خود بیان کر دی ہیں۔

پہلی تین چیزوں کے بارے میں فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ، وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا،	’’ایمان والو، نشے کی حالت میں نماز کی جگہ کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ جو کچھ کہہ رہے ہو، اُسے سمجھنے لگو، اور جنابت کی حالت میں بھی، الّا یہ کہ بس گزر جانا پیش نظر

[۱] یعنی وہ حالت جو کسی شخص کو مجامعت یا انزال سے لاحق ہوتی ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ، فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا. (النساء۴:۴۳)

ہو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو، یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اُس سے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔ بے شک، اللہ درگذر کرنے والا اور بخشش فرمانے والا ہے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ، وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ. مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ، وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائده۵:۶)

''ایمان والو، جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرلو، اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو، اور اگر جنابت کی حالت ہو تو نہالو۔ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رفع حاجت کر کے آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اُس سے اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کرلو۔ اللہ تم پر زندگی تنگ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کردے تاکہ تم اُس کے شکرگزار بنو۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِسی طرح قبلہ کے بارے میں فرمایا ہے:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ. (البقرہ۲:۱۴۴)

''تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے رہتے ہیں، (اے پیغمبر)، سو ہم نے فیصلہ کرلیا کہ تمھیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں جو تمھیں پسند ہے۔ لہٰذا اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو، اور جہاں کہیں بھی ہو (نماز میں) اپنا رخ اِسی کی طرف کرو۔''

نشے اور جنابت کو اِن آیات میں یکساں مفسد نماز قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اِن کے ساتھ نماز اور نماز کی جگہ کے قریب نہ جاؤ۔ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں حالتیں نجاست کی ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شراب جس طرح عقل کو معطل کر دیتی ہے، اِسی طرح جنابت کا انقباض

بھی اُس انشراح اور حضورِ قلب کو ختم کر دیتا ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے۔ اِس میں اتنی رخصت، البتہ اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے کہ اِس حالت میں کوئی شخص اگر کسی ضرورت کے باعث مسجد کے اندر سے محض گزرنا چاہے تو گزر سکتا ہے۔ فرمایا ہے کہ جنابت کی اِس حالت کے بعد غسل ضروری ہے، اِس کے بغیر نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اِس غسل کے لیے اِن آیات میں 'تغتسلوا' اور 'فاطهروا' کے الفاظ آئے ہیں، اِن کا تقاضا ہے کہ اِسے پورے اہتمام کے ساتھ کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اسوہ اِس کے متعلق روایتوں میں بیان ہوا ہے، اُس کی تفصیل یہ ہے:

پہلے ہاتھ دھوئے جائیں،

پھر شرم گاہ کو بائیں ہاتھ سے دھو کر اچھی طرح صاف کیا جائے،

پھر پورا وضو کیا جائے، سوائے اِس کے کہ پاؤں آخر میں دھونے کے لیے چھوڑ دیے جائیں،

پھر بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر پر اِس طرح پانی ڈالا جائے کہ وہ اُن کی جڑوں تک پہنچ جائے،

پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے،

آخر میں پاؤں دھو لیے جائیں۔

سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت کرتے تو پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر دائیں ہاتھ سے بائیں پر پانی ڈال کر اپنی شرم گاہ صاف کرتے، پھر نماز کے وضو کی طرح وضو کرتے، پھر پانی لیتے اور اپنی انگلیاں بالوں کی جڑوں میں ڈال دیتے، یہاں تک کہ جب دیکھ لیتے کہ پانی جلد تک پہنچ گیا ہے تو اپنے سر پر تین چلو پانی انڈیلتے، پھر سارے جسم پر پانی بہا لیتے، پھر دونوں پاؤں دھوتے۔[41]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ سیدہ میمونہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غسل جنابت کے لیے پانی رکھا تو آپ نے پہلے دونوں ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھوئے۔ پھر اپنا ہاتھ برتن میں ڈالا اور اُس سے اپنی شرم گاہ پر پانی بہایا اور اُسے بائیں ہاتھ سے دھویا، پھر اپنا یہ ہاتھ زمین پر اچھی طرح رگڑا، پھر نماز کے لیے جس طرح وضو کرتے ہیں، اُسی طرح وضو کیا، پھر چلو میں بھر کر تین مرتبہ پانی سر پر بہایا، پھر سارا بدن دھویا، پھر اُس جگہ سے ہٹے اور دونوں پاؤں دھوئے۔[42]

وضو کا طریقہ اِن آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے منہ دھویا جائے، پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوئے جائیں، پھر پورے سر کا مسح کیا جائے اور اِس کے بعد پاؤں دھو لیے جائیں۔ پورے سر کا مسح اِس لیے ضروری ہے کہ اِس حکم کے لیے آیت میں

---

[41] مسلم، رقم ۳۱۶۔

[42] مسلم، رقم ۳۱۷۔

’و امسحوا برو ء سکم‘ کے الفاظ آئے ہیں اور عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ ’ب‘ اِس طرح کے مواقع میں احاطے پر دلیل ہوتی ہے۔ اِسی طرح پاؤں کا حکم، اگرچہ بظاہر خیال ہوتا ہے کہ ’و امسحوا‘ کے تحت ہے، لیکن ’ارجلکم‘ کے بعد ’الی الکعبین‘ کے الفاظ ہیں جو پوری قطعیت کے ساتھ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ اِس کا عطف ’ایدیکم‘ پر ہے۔ اِس لیے کہ یہ اگر ’برو ء سکم‘ پر ہوتا تو اِس کے ساتھ ’الی الکعبین‘ کی قید غیر ضروری تھی۔ تیمّم میں، دیکھ لیجیے کہ جہاں مسح کا حکم دیا گیا ہے، وہاں ’الی المرافق‘ کی قید اِسی بنا پر ختم کر دی ہے۔ چنانچہ پاؤں لازماً دھوئے جائیں گے۔ آیت میں اُن کا ذکر محض اِس وجہ سے موخر کر دیا گیا ہے کہ وضو میں اعضا کی ترتیب لوگوں پر واضح رہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ وضو بالعموم کس طرح کرتے تھے؟ اِس سلسلہ کی تمام روایات کو جمع کرنے سے اِس کی جو صورت سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ دانت صاف کرتے، پھر دائیں سے وضو شروع کرتے، پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر پانی سے تین دفعہ کلی کرتے، پھر تین دفعہ ناک میں پانی ڈالتے اور ناک اچھی طرح صاف کرتے، پھر تین دفعہ منہ دھوتے اور ڈاڑھی کا خلال کرتے، پھر کہنیوں تک ہاتھ دھوتے، پھر الگ پانی لے کر سر پر مسح کرتے اور اُس کے ساتھ اندر اور باہر سے کانوں کی صفائی کرتے، سر کا مسح اِس طرح کرتے کہ پیشانی سے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے تک لے جا کر پھر واپس لے آتے، اِس کے بعد پہلے دایاں اور پھر بایاں پاؤں دھوتے تھے۔[۴۳]

وضو کے اعضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر ایک مرتبہ اور بعض موقعوں پر دو مرتبہ بھی دھوئے ہیں۔[۴۴]

روایتوں سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے وضو کے بعد ’اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ، وحدہ لا شریک لہ، و اشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ‘[۴۵] کہنے اور دو رکعت نماز پڑھنے کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔[۴۶]

اِسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے سے پہلے وضو کرنے،[۴۷] بالخصوص جنابت کی حالت میں سونے، کھانے پینے اور دوبارہ مباشرت سے پہلے وضو کرنے کی ترغیب دی اور اِسے پسند فرمایا ہے۔[۴۸]

۴۳؎ بخاری، رقم ۱۵۹، ۱۸۶۔ مسلم، رقم ۲۲۶، ۲۳۵۔

۴۴؎ بخاری، رقم ۱۵۷، ۱۵۸۔

۴۵؎ ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ تنہا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے بندے اور رسول ہیں۔“

۴۶؎ مسلم، رقم ۲۳۴۔

۴۷؎ بخاری، رقم ۲۴۷۔ مسلم، رقم ۲۷۱۰۔

۴۸؎ مسلم، رقم ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۰۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وضو کی فضیلت میں آپ کے جو ارشادات نقل ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض یہ ہیں:

عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندۂ مومن جب وضو کرتا اور اُس میں کلی کرتا ہے تو اُس کے منہ کے گناہ جھڑ جاتے ہیں؛ اور جب ناک میں پانی ڈالتا ہے تو ناک کے گناہ جھڑ جاتے ہیں؛ اور جب چہرہ دھوتا ہے تو چہرے کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ پلکوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب سر کا مسح کرتا ہے تو سر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ کانوں سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔ فرمایا: پھر اُس کا مسجد جانا اور نماز پڑھنا اِس پر مزید ہوتا ہے[۴۹]۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میری امت کے لوگ بلائے جائیں گے تو وضو کے اثر سے اُن کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔ سو جس کا جی چاہے، وہ اپنی یہ روشنی بڑھا لے[۵۰]۔

وضو اگر ایک مرتبہ کر لیا جائے تو اُس وقت تک قائم رہتا ہے، جب تک کوئی ناقض حالت آدمی کو پیش نہ آ جائے۔ چنانچہ وضو کی یہ ہدایت اُس حالت کے لیے ہے، جب وضو باقی نہ رہا ہو، الاّ یہ کہ کوئی شخص نشاط خاطر کے لیے تازہ وضو کر لے۔ اِس صورت میں یہ شریعت کا مطالبہ نہیں، بلکہ محض فضیلت کی چیز ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وضو کے نواقض درج ذیل ہیں:

۱۔ پیشاب کرنا۔

۲۔ پاخانہ کرنا۔

۳۔ ریح کا خارج ہونا، خواہ آواز سے ہو یا آہستہ۔

۴۔ مذی یا ودی کا خارج ہونا۔

یہ چیزیں کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہوں تو اِن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نیند اور بے ہوشی بجائے خود ناقض وضو نہیں ہے، لیکن اِس میں چونکہ آدمی اپنے وضو پر متنبہ نہیں رہتا، اِس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اِس کے بعد بھی وضو لازماً کر لیا جائے۔

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں مشکل ہو جائیں تو نساء اور مائدہ کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں، اُن میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اِس کا طریقہ اُنھی آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی پاک جگہ دیکھ کر اُس سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ آپ نے اِس

۴۹؎ الموطا، رقم ۳۰۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ وہ گناہ مراد نہیں ہیں جن کے لیے توبہ اور تلافی کرنا یا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

۵۰؎ بخاری، رقم ۱۳۶۔

کے لیے دونوں ہاتھ مٹی پر مارے، پھر اُن پر پھونک مار کر الٹے ہاتھ سے سیدھے ہاتھ پر اور سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ پر مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے چہرے پر مسح کر لیا[۵۱]۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ تیمّم ہر قسم کی نجاست میں کفایت کرتا ہے۔ وضو کے نواقض میں سے کوئی چیز پیش آئے تو اُس کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے اور مباشرت کے بعد غسل جنابت کی جگہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح یہ صراحت بھی کی ہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں پانی موجود ہوتے ہوئے بھی آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مرض میں وضو یا غسل سے ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، اِس وجہ سے یہ رعایت ہوئی ہے۔ اِسی طرح سفر میں مختلف حالتیں ایسی پیش آ سکتی ہیں کہ آدمی کو تیمّم ہی پر قناعت کرنی پڑے۔ مثلاً، پانی نایاب تو نہ ہو، لیکن کمیاب ہو، اندیشہ ہو کہ اگر غسل وغیرہ کے کام میں لایا گیا تو پینے کے لیے پانی تھڑ جائے گا یا یہ ڈر ہو کہ اگر نہانے کے اہتمام میں لگے تو قافلے کے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں گے یا ریل اور جہاز کا ایسا سفر ہو کہ غسل کرنا شدید زحمت کا باعث ہو۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمّم کے اِسی حکم پر قیاس کرتے ہوئے موزوں اور عمامے پر مسح کیا[۵۲] اور لوگوں کو اجازت دی ہے کہ اگر موزے وضو کر کے پہنے ہوں تو اُن کے مقیم ایک شب و روز اور مسافر تین شب و روز کے لیے موزے اتار کر پاؤں دھونے کے بجائے اُن پر مسح کر سکتے ہیں[۵۳]۔

اِسی طرح غسل کے معاملے میں یہ رخصت بیان فرمائی ہے کہ عورتوں کے بال اگر گندھے ہوئے ہوں تو اُنھیں کھولے بغیر اوپر سے پانی بہا لینا ہی کافی ہے[۵۴]؛ اور غسل جن چیزوں سے واجب ہوتا ہے، وہ اگر بیماری کی صورت اختیار کر لیں تو ایک مرتبہ غسل کر لینے کے بعد باقی نمازیں اُس کے بغیر بھی پڑھی جا سکتی ہیں[۵۵]۔

تیمّم سے بظاہر کوئی پاکیزگی تو حاصل نہیں ہوتی، لیکن اگر غور کیجیے تو اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ شریعت میں یہ چیز بالعموم ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جب اصلی صورت میں کسی حکم پر عمل کرنا ممکن نہ ہو یا بہت مشکل ہو جائے تو شبہی صورت میں اُس کی یادگار باقی رکھی جائے۔ اِس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ حالات معمول پر آتے ہی طبیعت اصلی صورت کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

نماز کے لیے قبلہ کی تعیین بھی ضروری ہے۔ بالبداہت واضح ہے کہ اِس کے بغیر نماز باجماعت کا کوئی نظم قائم نہیں کیا جا

۵۱؎ بخاری، رقم ۳۳۸، ۳۴۷۔ ابوداؤد، رقم ۳۲۱۔

۵۲؎ بخاری، رقم ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۶۔ مسلم، رقم ۲۷۲، ۲۷۵۔

۵۳؎ مسلم، رقم ۲۷۶۔

۵۴؎ مسلم، رقم ۳۳۰۔

۵۵؎ بخاری، رقم ۳۰۶۔

سکتا۔ الٰہی شریعتوں میں اِسی بنا پر اِس کا حکم ہمیشہ رہا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے جب مصر میں بنی اسرائیل کی مذہبی تنظیم شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں حکم دیا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مقامات نماز کے لیے خاص کر لیے جائیں اور وہ نماز کے لیے اپنے جو گھر مخصوص کریں، اُنھیں قبلہ قرار دے کر نماز با جماعت کا اہتمام کیا جائے[۵۶]۔ بعد میں بیت المقدس کی تعمیر تک اُن کے ہاں یہی حیثیت اُس تابوت کو حاصل رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہود بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ آپ کو بھی اسی کا حکم دیا گیا اور اِس کی حکمت یہ بتائی گئی کہ اِس سے بنی اسمٰعیل کا امتحان مقصود تھا کہ وہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں یا اپنے تعصّبات کی بنا پر اُس سے روگردانی کا رویہ اختیار کرتے ہیں[۵۷]۔ یہ مقصد پورا ہو گیا تو تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور مسلمانوں کے لیے بیت الحرام کو ہمیشہ کے لیے قبلہ مقرر کر دیا گیا۔

سورۂ بقرہ کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اُس میں یہی حکم بیان ہوا ہے۔ مسجد حرام سے مراد اِس آیت میں وہ عبادت گاہ ہے جس کے درمیان میں بیت اللہ واقع ہے۔ اِس کی طرف رخ کرنے کے لیے 'فول وجهك شطر المسجد الحرام' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن سے واضح ہے کہ مقصود بیت اللہ کی طرف منہ کرنا ہی ہے، بالکل ناک کی سیدھ میں بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا مطالبہ اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ تاہم یہ بات آیت میں بڑی تاکید کے ساتھ کہی گئی ہے کہ مسجد حرام کے اندر یا باہر، مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، نماز میں اُن کا رخ اِسی مسجد کی طرف ہونا چاہیے۔ اِس تاکید کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو اُسے ہی قبلہ بناتے تھے، لیکن اُس سے باہر نکل کر مشرق یا مغرب کو قبلہ بنا لیتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ سفر و حضر میں اور بیت الحرام کے اندر اور باہر، ہر جگہ اِسی مسجد کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

اِس سے وہ صورتیں، ظاہر ہے کہ مستثنیٰ ہوں گی، جب قبلہ کی تعیین مشکل ہو یا غیر معمولی حالات میں کوئی شخص چلتے ہوئے یا سواری پر نماز پڑھنے کے لیے مجبور ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ اپنی نفل نمازیں، اِس خیال سے کہ اُن کے لیے رکنا قافلے کے لیے باعث زحمت ہو گا، سواری پر بیٹھے ہوئے اور اُسی کے رخ پر ادا کر لیتے تھے[۵۸]۔

[باقی]

۵۶؎ یونس ۱۰: ۸۷۔

۵۷؎ البقرہ ۲: ۱۴۳۔

۵۸؎ بخاری، رقم ۱۰۹۳۔ مسلم، رقم ۷۰۱۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۷)

پاکستان اور عروج وزوال کا قانون

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس باب میں ہم پاکستانی قوم کے حالات اور تاریخ کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور عروج وزوال کے ضابطوں کا اس پر اطلاق کرتے ہوئے اصلاح احوال کا ایک لائحۂ عمل تجویز کریں گے۔ اس عمل میں ہمیں نہ صرف عام اقوام کے بارے میں بیان کیے گئے پہلے باب کے مباحث کو ذہن میں رکھنا ہوگا، بلکہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ پاکستانی قوم ایک معاہد قوم ہے جس نے خدا کے ساتھ باقاعدہ ایک عہد باندھ کر اپنا وجود حاصل کیا ہے۔ وہ عہد یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایک خود مختار خطۂ زمین دے تو ہم دنیا کے سامنے ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا نقشہ پیش کر کے دکھائیں گے۔ ہم پچھلے باب میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو مسلمان پیدا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خدا کے محبوب ہیں، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ ان کے ذریعے ایک خدا پرستانہ معاشرہ لوگوں کے سامنے قائم رہے۔ اہل پاکستان دوسرے مسلمانوں کی طرح اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے پابند ہیں، مگر انھوں نے ایک عام اسلامی ذمہ داری کو عہد کی شکل دے کر اپنے معاملے کو خاص کر لیا ہے۔ کوئی فرد یا طبقہ ہمارے اس مقدمے کو اگر نہیں مانتا تب بھی وہ اپنے مسلمان ہونے کا منکر تو نہیں ہو سکتا۔ اسلام کے اس اقرار کے بعد خدا پرستانہ معاشرہ قائم کرنا بہر حال مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الاّ اللہ'' کا نعرہ لگا کر جو ملک حاصل کیا گیا، اس کے باسیوں کے لیے توحید سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری سے بھاگنے کا مطلب تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پاکستانی قوم تاریخ کے آئینے میں

ہم پہلے باب میں قوموں کی زندگی میں آنے والے مختلف مراحل کو بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک قومی ترقی کا لائحۂ عمل درست طور پر تجویز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ حتمی طور پر معلوم ہو کہ قوم اپنی زندگی کے کس مرحلہ میں ہے۔ پاکستانی قوم کے معاملے میں اس چیز کا جاننا بہت مشکل نہیں، کیونکہ پاکستانی قوم ایک جدید تاریخی قوم ہے۔ تاریخی قوم سے ہماری مراد ایک ایسی قوم ہے جو توالد و تناسل کے فطری طریقے کے بجائے تاریخی عوامل کے نتیجے میں، مختلف گروہوں کے ملاپ سے وجود میں آتی ہے۔ دوسری چیز جو اس ضمن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ ہے کہ قوم کے اجتماعی مزاج کا تجزیہ کیا جائے۔ اس کے فاسد عناصر کی بیخ کنی کی جائے اور صالح عناصر کو فروغ دیا جائے۔ اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں کہ ہم اس خطے کی تاریخ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں، اس لیے ہم تاریخی تفصیل کے بجائے تاریخی پس منظر کی روشنی میں ہندوستان کی مسلم قومیت کے ارتقا اور اس کے اجتماعی مزاج کے اہم عناصر بیان کریں گے۔ اس بحث کی تفہیم کے لیے بہتر ہو گا کہ قومی زندگی کے مراحل کی اس تفصیل کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جسے ہم نے کتاب کے آغاز میں بیان کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دور تشکیل: محمد بن قاسم (۷۱۱ء) سے اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) کے عہد تک

مسلمانوں نے بحیثیت فاتح پہلی دفعہ محمد بن قاسم کی زیر قیادت ۷۱۱ء میں دیبل کے راستے ہندوستان میں قدم رکھا۔ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے قدم سندھ اور ملتان تک جا پہنچے۔ اس کے حسن سلوک کی بدولت فاتحین نے دھرتی کے بعد لوگوں کو بھی فتح کرنا شروع کر دیا، مگر اس سے پہلے کہ اسلام کی کرنیں اس پورے برعظیم کو روشن کرتیں، سلیمان جیسا خود پرست اور کوتاہ نظر شخص خلافت دمشق کے تخت پر فائز ہوا۔ ذاتی عناد میں اندھا ہو کر اس نے اندلس اور سندھ کے فاتحین ہی نہیں، بلکہ اسلام کی تاریخ اور ان خطوں کی تقدیر کو بھی اپنے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کر دیا۔ اس نے اندلس اور سندھ کے عظیم فاتحین کو واپس بلا کر قید اور موت کے حوالے کر دیا، جس کے بعد ان علاقوں میں صدیوں کے لیے اسلام کی پیش قدمی رک گئی۔ اور جب صدیوں بعد شروع ہوئی تو براعظم یورپ اور برعظیم ہند کے دوسرے کناروں سے۔ جب مشرقی یورپ کو عثمانی ترکوں اور شمال مغربی ہندوستان کو افغان سرداروں نے فتح کیا، مگر ان کی کامیابیاں زمینی فتوحات تک محدود رہیں اور قرون اولیٰ کی طرح انسانی دلوں کو فتح نہ کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مسلمانوں کی تلوار کمزور ہوئی تو غیر مسلموں نے بلا تاخیر انھیں اقتدار سے باہر کر دیا۔

محمد بن قاسم کے تقریباً تین سو سال بعد ہند پر مسلمانوں کی دوسری یلغار کا آغاز ہوا۔ ۹۹۴ء سے ۱۰۲۱ء تک سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں پشاور اور لاہور تک مسلمانوں نے قدم جما لیے، لیکن ہند کی پہلی مسلم حکومت ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری نے قائم کی۔ ۱۲۰۶ء سے لے کر ۱۵۲۶ء تک سلاطین دہلی کا زمانہ ہے جس میں خاندان غلامان کے علاوہ خلجی،

تغلق، سادات اور لودھی خاندان تخت دہلی پر براجمان رہے۔ بیچ میں تیمور نے یہاں چنگیزی بربریت کا بازار گرم کیا۔ آخر کار ۱۵۲۶ء میں بابر نے عظیم مغل حکومت قائم کی جس نے ہند میں مسلم اقتدار کو اس کی آخری بلندی پر پہنچا دیا۔ اس سلسلہ کی آخری عظیم کڑی اورنگ زیب عالم گیر (متوفی ۱۷۰۷ء) تھا۔ اس عالی ہمت حکمران کے ساتھ ہی باہر سے آنے والے مسلم حکمرانوں کے اقتدار کا سورج گہنا گیا۔

۷۱۱ء سے ۱۷۰۷ء تک کے قریباً ہزار سالہ دور میں برصغیر میں ایک جدید قوم کا ظہور ہوا جو اپنے مذہب، تہذیب، تمدن، روایات، نظام اخلاق اور ثقافت کی بنیاد پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتی تھی۔ اس کا پہلا اظہار اس وقت ہوا، جب اکبر اعظم نے ہندوستان کو ایک اکائی جان کر یہاں ایک متحدہ قومیت کو، اپنے دیے ہوئے دین اکبری کی بنیاد پر، فروغ دینا چاہا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اس مسلم قوم کے تشخص کے دفاع کے لیے جو کچھ کیا، وہ محض ان کا شخصی کارنامہ نہیں تھا، بلکہ ان کے پیچھے اس نئی قوم کے اکابرین بھی کھڑے ہوئے تھے۔ دور تشکیل کا یہی عرصہ ہے جس میں ہند کی مسلم قومیت کے اجتماعی مزاج نے جنم لیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دور تشکیل کا قومی مزاج

اس نئی قوم کی اساس برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے ان مسلمانوں نے رکھی جو خود کو اس خطے کے ہندوؤں سے الگ اور ایک مختلف جداگانہ تشخص کا حامل سمجھتے تھے۔ اس جداگانہ تشخص کی بنیاد ان کے مذہب اسلام میں تھی۔ اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف حیات و کائنات کے بارے میں ایک مکمل نقطۂ نظر رکھتا ہے، بلکہ اپنے پیرو کاروں کو عملی زندگی میں ہر آن اس نقطۂ نظر سے متعلق بھی رکھتا ہے۔ وہ مذہب کو تہذیب بنا دیتا ہے۔ مثلاً اسلام میں توحید کی تعلیم نہ صرف اس کی بنیادی کتاب قرآن کریم میں ابدی طور پر درج ہے، بلکہ نماز کی صورت میں دن میں پانچ دفعہ اس کا بھرپور اظہار کرنا مسلمانوں کی انتہائی مضبوط روایت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے پیرو کار، یعنی مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ رہ تو سکتے ہیں، ان میں جذب نہیں ہو سکتے۔

برصغیر میں اس چیز کو جس حقیقت نے اور زیادہ مستحکم کیا، وہ یہ تھی کہ مسلمان اس خطے میں نہ صرف فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور انھوں نے ہزار سال تک یہاں حکومت کی، بلکہ قلبی طور پر ہمیشہ وہ مسلمانوں کی مرکزی جمعیت، یعنی خلافت سے منسلک رہے۔ اس بات کی اہمیت یوں بھی بہت زیادہ ہے کہ اس پورے عرصے میں مسلمانوں کی تینوں خلافتیں، یعنی بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانی خلافت دنیا کی سپر پاورز تھیں۔ جن سے تعلق کا اظہار بہر حال باعث افتخار تھا۔ اس کے علاوہ متعدد وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی طرف بلاد اسلامیہ سے مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا۔ خاص طور پر جب تاتاریوں نے مشرق وسطیٰ سے وسط ایشیا تک مسلم علاقوں کو تخت و تاراج کر ڈالا تو ان علاقوں کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جان و ایمان بچا کر

ہندوستان آ گئی۔ یہ مسلمان اپنے ساتھ اپنا مذہب، تمدن، زبان، تہذیب اور روایات بھی لائے۔ ہندو اکثریت میں گھری اس اقلیت کو اسلام کی کشش نے بہت جلد ایک اکائی میں بدلنا شروع کر دیا اور ان کے باہمی میل جول سے ایک نئی قوم کی داغ بیل پڑنے لگی جو اپنے پس منظر کی بنا پر اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں بقیہ عالم اسلام سے بہت قریب تھی۔

یہ مسلمان چونکہ تاتاریوں کے ہاتھوں اپنی تہذیب وتمدن کو مٹتے دیکھ کر آئے تھے، اس لیے ان میں اپنے مذہب کے فروغ کا غیر معمولی داعیہ موجود تھا۔ مقامی آبادی میں غیر مسلموں کی کثرت نے اس جذبے کو اور مہمیز دی۔ چنانچہ یہ لوگ اسلام کے داعی بن کر مقامی لوگوں میں اپنے اثرات پیدا کرنے لگے، جس کے نتیجے میں اسلام، عوام الناس میں فروغ پاتا رہا۔ ہندووانہ کثرت پرستی کے مقابلے میں عقیدۂ توحید کی سادگی، اور طبقاتی نظام کے مقابلے میں مساوات اور اسی بنیاد پر زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع اسلام کی وہ غیر معمولی کشش ثابت ہوئی جس کی بنا پر اسلام بہت معمولی کوشش سے بڑی سطح پر لوگوں میں پھیل گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ حقیقت کہ اسلام ایک غالب قوم کا مذہب تھا، فروغ اسلام میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

یہاں یہ حقیقت ذہن میں رہنی چاہیے کہ محمد بن قاسم کے بعد کسی حکمران نے مقامی لوگوں میں اسلام کی ترویج تو کجا اسلام کے مطابق ایک اچھا مسلمان حکمران بننے کی کوشش بھی نہیں کی، ورنہ یہ پورا خطہ مصر کی طرح عالم اسلام کا حصہ بن جاتا۔ اس کا ایک ثانوی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اس خطہ کے مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی قیادت کو ایک جگہ دیکھنے کی روایت نہیں رہی، کیونکہ انھیں مذہب جن لوگوں سے ملا، ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا اور سیاسی لوگوں کا طرز عمل بالعموم اسلام کے مثالی رویے سے بہت ہٹ کر تھا۔ چنانچہ آج تک یہاں کے مسلمان اہل مذہب کو، مذہبی بنیادوں پر، اقتدار دینے کے عادی نہیں۔

اس خطے کی ایک بڑی اہم روایت تصوف بھی رہی ہے۔ اس بارے میں تو خیر اب دو آرا پیدا ہو چکی ہیں کہ یہاں اسلام کے فروغ میں اہل تصوف کا کیا کردار تھا، مگر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوستان کے مخصوص مذہبی پس منظر کی بنا پر یہاں کے عوام الناس میں تصوف اور اہل تصوف کے بہت اثرات ہوئے۔ مسلم حکمرانوں کے بعض ناپسندیدہ اقدامات کے باوجود یہ اہل تصوف تھے جنھوں نے مقامی لوگوں کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نفرت کے وہ جذبات نہیں پیدا ہونے دیے جس کے بعد ایک فاتح اقلیت، مفتوح اکثریت کی شدید نفرت کا نشانہ بن کر اپنا وجود کھو دیتی ہے۔

ان سب کے ساتھ یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ مسلمان یہاں ہمیشہ ایک اقلیت رہے۔ یہ اقلیت نہ صرف اپنے اردگرد پھیلی اکثریت سے کچھ نہ کچھ متاثر ہوئی، بلکہ اکثریت میں سے بھی جو لوگ تبدیلی مذہب کے بعد ان میں شامل ہوئے، اپنے بہت سے اثرات ساتھ لائے۔ چنانچہ مقامی ہندو آبادی کے بہت سے اثرات مسلمانوں پر مرتب ہوئے جس کے مختلف مظاہر کی جھلکیاں ان کی تہذیب، روایات اور مذہبی تصورات میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

یہاں کی مسلم قومیت کا ایک اہم مذہبی پہلو یہ تھا کہ وہ اس عربی سادگی کے ساتھ یہاں نہیں آئی تھی جو ابتدائی دور کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمانوں کا خاصہ تھی۔ بلکہ بنوعباس کے دور میں پیدا ہو جانے والا مخصوص فقہی ذہن اپنے ساتھ لائی تھی۔ بعد میں جب مغلیہ دور میں بحری راستے سے حج کا دروازہ کھلا تو لوگ کثرت سے حجاز جانے لگے اور اس کے نتیجے میں حدیث کے اثرات بھی دینی حلقوں میں نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مقامی اثرات کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ ان سب چیزوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کا مذہبی مزاج توہم پرستی، تصوف، فقہ اور حدیث کے تعامل سے وجود میں آیا۔ تاہم ابھی تک ان میں ابتدائی تین چیزوں کا اثر زیادہ تھا۔

اس دور کی کی بڑی نمایاں خصوصیت علمی جمود ہے۔ دینی اور دنیوی، دونوں اعتبارات سے اس دور میں کوئی نمایاں پیش رفت نظر نہیں آتی۔ دینی علم کی روایت بری بھلی جیسی بھی تھی، مذہبی ضرورت کے تحت بہر حال قائم رہی، مگر دنیوی علوم میں ابتدائی درجہ کی ترقی بھی نظر نہیں آتی۔ مغلیہ سلطنت کے پاس دنیا کے بہترین وسائل تھے۔ ان کے دربار میں یورپ کے لوگ بھی موجود تھے جن سے وہ یورپ میں ہونے والی علمی سرگرمیوں سے آگاہی حاصل کر سکتے تھے، مگر انھیں علم سے زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے میں دل چسپی تھی، اس لیے انھوں نے اس سمت میں کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ آنے والے دنوں میں انھوں نے بھگت لیا۔ دنیوی علوم میں غفلت ایک ایسا ناقابل معافی جرم ہوتا ہے جس کی سزا تاریخ فوراً دے دیتی ہے۔

عوام کی سطح پر اس نئی قومیت کا سب سے بڑا اظہار اردو زبان تھی۔ گو ابھی اسے سرکاری سطح پر وہ حیثیت حاصل نہیں تھی، مگر مختلف پس منظر کے حامل لوگوں کے لیے اردو باہمی رابطہ کا بنیادی ذریعہ بننے لگی تھی، اور ایک وقت آیا کہ اردو مسلم قومیت کی مسلمہ شناخت بن گئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اٹھارھویں صدی کے آغاز میں صورت حال یہ تھی کہ ہند میں مسلمانوں کے ہزار سالہ خارجی اقتدار کے نتیجے میں ایک مسلم قومیت نے جنم لے لیا تھا۔ اسلام اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا اور اسی بنیاد پر اس نے، ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ، مرکزی قومی دھارے میں جذب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے دنیاے اسلام سے اپنے تعلق پر فخر تھا اور وہ خود کو ایک بین الاقوامی ملت کا حصہ سمجھتی تھی، مگر اس کے باوجود زمینی حقائق یہ تھے کہ اس نے مقامی ہندو تہذیب کا گہرا اثر قبول کیا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلم ہندو ثقافت کے امتزاج سے اس کا ایک نیا چہرہ ابھر رہا تھا۔ اس میں ہندو کلچر اور اس کی توہم پرستی کے گہرے اثرات بھی تھے اور مسلمانوں کی مروج مذہبیت، یعنی فقہ، تصوف اور ان کے تہذیبی عناصر بھی شامل تھے۔ یہ وہ دور تھا، جب علم کا سورج مغرب سے طلوع ہونے لگا تھا، مگر یہاں جہالت کی تاریک رات اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اہل اقتدار کا مقصد اپنی سلطنت کی توسیع و حفاظت اور اہل علم و مذہب کا کام رائج علوم کی تقلید اور انھیں بیورو کریسی مہیا کرنا تھا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں قوم اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

تعمیر و شناخت کا پہلا دور: ۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک

تعمیر کا آغاز تخریب سے ہوتا ہے۔ یورپ کا دور تعمیر بھی اس وقت شروع ہوا، جب صلیبی جنگوں میں انھیں مسلمانوں کے

ہاتھوں بدترین شکستیں ہوئیں۔ یہی ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے نئے دور کے آغاز کے لیے ضروری تھا کہ پرانی شکستہ عمارت گر جائے۔ چنانچہ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک انہدام کا یہ عمل پورا ہوا۔ اس دوران میں نئی عمارت کی تعمیر کا آغاز اس امت کے ایک بطل جلیل نے کر دیا تھا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

ہندوستان پر مسلمانوں کا اقتدار کم وبیش ہزار سال تک رہا، مگر اس اقتدار کا سرچشمہ خارجی تھا، یعنی سارے حکمران باہر سے آئے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد اس خارجی قوت کو زوال آنا شروع ہوا۔ یہ دراصل مسلمانوں کے اس بین الاقوامی علمی زوال کا نتیجہ تھا جو بغداد کی تباہی کے بعد شروع ہوا تھا۔ اس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر بھی پڑا اور وہ بھی شاہ راہ زوال پر گامزن ہو گئے۔ اس زوال کا ایک اہم محرک جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں پھیلنے والی عیش وعشرت کی فضا بھی تھی جس نے مسلمانوں کے قویٰ کو بالکل ضعیف کر دیا۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ مرہٹوں کی جس قوت کو ابدالی نے ایک ضرب لگا کر توڑ ڈالا، اورنگزیب جیسا بہادر حکمران ربع صدی میں اسے کیوں نہ ختم کر سکا؟ بہر حال مسلمانوں کی دنیا پرستی رنگ لائی اور کابل سے برما تک پھیلی مسلم حکومت تھوڑے دنوں میں ہی دار السلطنت دہلی کے اطراف تک محدود ہو گئی۔ اس دور کا ایک جملہ جو زبان زد خاص وعام ہو گیا تھا، صورت حال کی بہت اچھی منظر کشی کرتا ہے، یعنی سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔

اب یہ بات بالکل صاف نظر آ رہی تھی کہ دہلی میں بھی مسلم حکومت کے اقتدار اور برصغیر میں مسلم قوم کا خاتمہ قریب آ گا ہے، مگر قدرت کو شاید ابھی اس خطے سے مسلمانوں کا خاتمہ منظور نہ تھا کہ اس دور میں ایک بہت بڑا قائد پیدا ہو گیا۔ ہماری مراد شاہ ولی اللہ سے ہے جو اورنگ زیب کے انتقال سے چار سال قبل ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اس قوم کی شناخت کو ہندو مرہٹوں کے فوری خطرے سے بچانے کے لیے افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو بلایا، بلکہ اس قوم کے اجتماعی مزاج میں بہت سے تعمیری عناصر داخل کیے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ذات میں، بلکہ اپنے خانوادے اور پیروکاروں کے ذریعے سے اس خطے میں مسلمانوں کے قومی مزاج کو بہت متاثر کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ اس علمی روایت کا احیا ہے جو صدیوں سے مردہ تھی۔ دین پر غور وفکر کی جو روایت انھوں نے ڈالی، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس خطے کے مسلمان فکری اعتبار سے پورے عالم اسلام کے لیے امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے عالم تھے۔ تصوف اور فقہ کی قدیم روایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن اور حدیث کو بھی قوم کے دینی مزاج میں شامل کیا۔ ان کے کاموں کے نتیجے میں مسلمانوں کے قومی مزاج میں مذہب کے اثرات مزید گہرے ہو گئے۔ نیز ان کے اثر سے پہلی دفعہ مذہبی قیادت نے سیاسی میدان کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی۔

تاہم اس دور کے مسلم معاشرے پر زوال کا وہ عمل شروع ہو چکا تھا جو ایک دفعہ جاری ہو جائے تو بڑے سے بڑا آدمی اسے اپنے منطقی انجام تک پہنچنے سے نہیں روک سکتا۔ چنانچہ اسی دور زوال میں سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے جاں نثار رفقا جیسے لوگ بھی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحابۂ کرام کے بعد ان کی نظیر نہیں ملتی، اس زوال کو روک نہ سکے۔ دوسری

طرف انگریز اپنی تمام تر علمی و حربی ترقی اور حوصلہ مندی کے ساتھ ہند میں قدم جما چکے تھے۔ مسلمانوں کی خارجی قوت کا یہ زوال ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ قدرت کا قانون اٹل ہوتا ہے۔ یہ قانون حرکت میں آیا اور گناہ گار و بے گناہ، سب اس قانون کی زد میں آ گئے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار ہی نہیں گیا، بلکہ ان کے بہترین لوگ اس ہنگامہ کی نظر ہو گئے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ خاک کا ڈھیر بن گیا۔

تاہم یہ زوال خارجی قوت کا تھا۔ ہندوستان میں ایک مسلم قوم جنم لے چکی تھی جو گرچہ اپنے دور طفولیت میں تھی، مگر تقدیر اس قوم پر مہربان تھی کہ اس موقع پر اس قوم میں ایک بہت بڑا لیڈر پیدا ہوا۔ یہ سر سید احمد خان تھے۔ وہ شاہ ولی اللہ کے بعد اس قوم کے دوسرے بڑے قائد تھے جس نے اس کے قومی مزاج کو بے انتہا متاثر کیا۔ ان سے اختلاف کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ خصوصاً ان کے بعض مذہبی خیالات کے حوالے سے ان پر بڑی تنقید ہوئی ہے۔ ہمیں بھی ان کے بعض مذہبی افکار، بلکہ ان کی قومی رہنمائی کے بعض پہلوؤں سے بھی اتفاق نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت قوم کو ایک واضح نقطۂ نظر اور راہ عمل دی، جب اس کے قویٰ آخری حد تک معطل ہو چکے تھے۔ تاریخ کی روشنی میں ہم نے یہ سیکھا ہے کہ زوال کی اس انتہا پر پہنچنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ قوم کو امید دلا کر متحرک کرنے کا ہوتا ہے...... صحیح رہنمائی کرنے کا نہیں۔ ایک دفعہ قوم میں زندگی کی لہر دوڑ جائے، اس کے بعد غلطیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے، لیکن اگر قوم مردہ ہو تو صحیح یا غلط عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر تو ایسی قوم زندگی کے دھارے سے کٹ کر ماضی کا ایک قصہ بن کر رہ جاتی ہے۔ زوال کی انتہا کو پہنچی ہوئی ایک قوم کو اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت کے مقابلہ کی سعی لاحاصل سے ہٹا کر آنے والے دنوں کی تیاری کی مہلت حاصل کرنا، ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ان کی فکر کا ایک دوسرا پہلو جو بڑا مستحسن ہے، وہ یہ ہے کہ اس پورے عمل میں انھوں نے اسلام کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے اسے اس دور کے علمی انکشافات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ اس کوشش میں وہ بہت کچھ ایسی باتیں کر گئے جو اسلام سے انحراف کے مترادف تھیں، تاہم جب اس دور کے حالات، ان کے کام کی نوعیت، دین پر اس دور میں ہونے والے محدود کام، انیسویں صدی کی سائنسی فکر اور دیگر عوامل کو ذہن میں رکھا جائے تو اسے بھی ان کے کارناموں کی صف میں ڈالنا چاہیے۔ ان کے بعد آنے والوں نے ان کی تصحیح کر دی، لیکن ان کے اس طرز عمل کے نتیجے میں قوم نہ صرف متحرک ہو گئی، بلکہ اسلام کو اس کے قومی مزاج میں مرکزی حیثیت حاصل رہی، اور یہ ان کی بڑی خدمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ انھی کی رہنمائی تھی جس کی بنا پر مسلمانوں نے ہندوؤں سے جدا اپنا ایک تشخص برقرار رکھا، وگرنہ اس دور کی ہماری دوسری قیادت تو ذہناً اس چیز کے لیے تیار تھی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ اصل مقصد ہے چاہے، اس کے بعد ہندوؤں کے ساتھ ایک ثانوی درجہ کی حیثیت میں رہنا پڑے۔ ہندوستان جس جمہوری نظام کی طرف بڑھ رہا تھا اور جس طرح ہماری مذہبی قیادت ہندوؤں سے کسی قسم کا معاہدہ کیے بغیر ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ اس خطے کے مسلمان ہمیشہ کے لیے اپنا قومی وجود کھو دیتے۔

سرسید کا ایک اور قومی کارنامہ یہ ہے کہ وہ اور ان کے رفقا نے اردو زبان کو بہت مختصر عرصے میں اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی جدید اور ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں آ گئی اور اس میں ہر قسم کے مضامین کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، وگرنہ اس سے قبل خواص کے لیے یہ شعر و ادب کی زبان اور عوام کے لیے محض ایک بولی تھی۔ بہت سے لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک نہیں کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد مسلمان جس طرح فارسی زبان سے کاٹ دیے گئے تھے، اس کے نتیجے میں وہ اپنے بہت بڑے تہذیبی اور علمی سرمایہ سے محروم ہو گئے تھے۔ مگر اردو کی بروقت ترقی نے مسلمانوں کو نہ صرف علمی طور پر بنجر ہونے سے بچا لیا، بلکہ ہندوستان کی مسلم قوم کو ایک ترقی یافتہ مشترکہ زبان عطا کی۔ زبان قومی اشتراک کی بہت بڑی وجہ ہوتی ہے۔

سرسید کے کارناموں کے یہ چند پہلو ہیں جن کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے باوا آدم ہیں، تاہم ان کی کوششوں کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کے نتیجے میں ہمارے قومی مزاج میں بعض منفی چیزیں شامل ہو گئیں۔ ان میں سب سے نمایاں مغرب پرستی کا رجحان تھا۔ بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رجحان کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی تباہ کن رویہ ہے، جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

بیسویں صدی کا نصف اول انسانیت کی تاریخ کا بہت ڈرامائی عرصہ رہا ہے۔ جس میں رونما ہونے والے واقعات کی نظیر پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ دو عظیم اور تاریخ انسانی کی سب سے تباہ کن جنگیں اسی عرصہ میں ہوئیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس خطہ کے مسلمانوں نے علی برادران کی قیادت میں تحریک خلافت میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ اس تحریک کا مقصد خلافت عثمانیہ کا تحفظ تھا۔ یہ اپنا مقصد تو حاصل نہیں کر سکی، مگر اس سے مسلمانان ہند کی امت مسلمہ سے وابستگی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو تاریخ کا یہی وہ مقام ہے جہاں پاکستان کی حقیقی اساسات آسمان اور زمین، دونوں میں نمودار ہوئیں۔ قومی زندگی میں اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مغربیت کا جو فروغ عوام میں شروع ہوا تھا، اس پر بند لگ گیا اور مغرب کے شکنجے میں جکڑے ہوئے پورے عالم اسلام کے برخلاف ہمارے ہاں مغربیت صرف طبقۂ اشرافیہ تک محدود ہو گئی اور مغربی تہذیب کی موجودہ یلغار تک، اس کا نفوذ عوام میں نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خود اعتمادی بھی اسی تحریک کی دین ہے۔

یہی وہ عرصہ ہے جس میں برصغیر کی مسلم قوم اپنے لیے ایک الگ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو سب سے بڑی اسلامی مملکت اور دنیا کی پانچویں بڑی ریاست بھی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دفعہ پھر قدرت نے اس قوم میں ایک بہت بڑا لیڈر پیدا کر دیا۔ دنیا اسے سر محمد اقبال کے نام سے جانتی ہے۔ مجدد الف ثانی سے شروع ہونے والے مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کے عمل کو انھوں نے ہی ایک وطن کی صورت دی۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے سے اس خطے کے مسلمانوں کو ایک جوش و ولولہ دیا۔ انھوں نے مغربی فکر پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ان کی ذہنی غلامی میں جانے سے روکا۔ انھوں نے ہی اجتہاد کی روایت کو مسلمانوں میں بھرپور طور پر زندہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ یہ اقبال تھے جنھوں نے مسلمانوں کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ایک خودمختار وطن کا تصور دیا، انھی نے اس ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے ایک بہترین قائد، یعنی محمد علی جناح کا انتخاب کیا۔ ان تمام اعتبارات سے اقبال کی خدمات بے مثل ہیں اور بلا شبہ وہ مفکر پاکستان کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ ولی اللہ، ان کے خانوادے، رفقا اور متوسلین، پھر سر سید اور ان کے رفقا کے بعد اقبال نے مسلمانوں کے قومی مزاج کو بہت متاثر کیا، تاہم اقبال نے قوم کے مزاج میں موجود جذباتیت کے عنصر کو بہت بڑھا دیا۔ وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ یہ قوم حال ہی میں ایک بڑے زوال سے گزری ہے۔ زوال کا آنا معمولی بات ہوتا ہے اور نہ بلا وجہ قوم کو زوال آتا ہے۔ زوال کا مطلب یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے۔ اس مردہ قالب میں نئی روح صرف جذباتی باتوں سے نہیں پیدا کی جا سکتی۔ حقیقت پسندانہ بنیادوں پر اس کی تربیت و تیاری بہت ضروری ہے، تاہم اس سے اقبال کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تاریخ کے ایک نازک لمحے میں موجود تھے۔ اس زمانے کے حالات کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی میں جانے سے بچایا جائے، کیونکہ ایک زوال پذیر قوم اگر کسی دوسری تہذیب کے زیر سایہ آجائے تو پھر لازماً اس کے بہت گہرے اثرات قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلاؤ۔ ایک الگ وطن کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ قوم کے تن مردہ میں حرارت پیدا کی جائے۔ اس عمل کے نتیجے میں اگر ایک خطۂ ارضی میسر آجاتا ہے تو پھر آنے والوں کے لیے یہ امکان باقی رہے گا کہ وہ ملت کے قومی تشخص کے بارے میں پریشان ہوئے بغیر اس کی تربیت کر سکیں گے۔ ہمارا احسن ظن ہے کہ اقبال کو اس چیز کا احساس تھا۔ ہمیں اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اقبال نے جس طرح قائد اعظم کو اس قوم کے سیاسی لیڈر کے طور پر چنا تھا، اسی طرح انھوں نے قومی تربیت کے لیے ایک اور بڑے آدمی کا انتخاب کیا تھا۔ ہماری مراد مولانا مودودی سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا بعد میں آنے والے وقتوں میں سیاسی مصالح سے خود کو الگ کر کے قوم کی تربیت کے لیے خاص نہ کر سکے، بلکہ بہت سطحی بنیادوں پر عملی سیاست کے میدان میں اتر گئے۔ جس کے بعد نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

اس دور میں سیاسی ہنگامہ آرائی بہت زیادہ رہی، لیکن دوسرے میدانوں میں بھی کام کا سلسلہ جاری رہا، اردو زبان کے حوالے سے شعر و ادب کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کی علمی اور دینی روایت میں بھی ارتقا ہوا۔ علی گڑھ، دیوبند اور ندوہ صرف تین اداروں کے نام ہی نہیں، بلکہ تین دینی، علمی، تہذیبی روایات کے نام ہیں جو بعد میں پاکستانی قوم کے مزاج پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوئے۔ یہ بالترتیب مغربیت، قدامت پرستی اور دین و دنیا کی یکجائی میں ڈھل گئے۔ تاہم جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے کہ فی الوقت اول الذکر دو انتہائیں ہی باقی رہ گئی ہیں اور عملاً اعتدال کی راہ مفقود ہو چکی ہے۔

بہرحال، قیام پاکستان تک قوم کے مزاج میں جو مزید عنصر داخل ہو گئے، ان میں سب سے اہم مسلم قوم کی مذہبی فکر کو مضبوط علمی بنیادوں کا میسر ہونا تھا۔ علم کی روایت دین و دنیا، دونوں اعتبارات سے مستحکم ہوئی۔ ایک طرف قرآن کریم اور بالخصوص حدیث کا چلن عام ہوا تو دوسری طرف مغربی تعلیم کے زیر اثر ہماری اشرافیہ میں مغربی تہذیب و فکر کا نفوذ بہت زیادہ ہو گیا۔

تاہم ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا تھا جو قدامت اور جدت میں ایک توازن قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس عرصہ میں مسلمان اقتدار کے تحفظ سے محروم اور اکثریتی فرقہ کی طرف سے خدشات میں مبتلا تھے، اس لیے ہندوؤں کے بالمقابل ایک قومی عصبیت نے ان تمام اندرونی اختلافات کو ڈھانک دیا جو آنے والے دنوں میں پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اس دور میں ہندی مسلمانوں کی طرح پوری ملت اسلامیہ سامراجی شکنجے میں جکڑی جا چکی تھی، اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے ان کے درد کو اپنا درد جانا اور امت سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہوا، تاہم بدقسمتی سے گہرے تجزیہ کے بجائے مسلمانوں کی قیادت پر جذباتی انداز سے معاملات کو دیکھنے کا رجحان غالب رہا اور وہ یہ نہ جان سکے کہ ماضی میں زوال کیوں آیا تھا اور مستقبل اپنے دامن میں کیا مسائل لیے آ رہا ہے۔

تعمیر و شناخت کا دوسرا دور: ۱۹۴۷ء سے آج تک

قیام پاکستان کے ساتھ اس خطے کی مسلم قومیت کو ایک الگ وطن اور علیحدہ شناخت مل گئی۔ ایک عظیم تہذیب، ایک سپر پاور کے ظہور کے تمام امکانات جمع ہو چکے تھے۔ یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ جب اسے سنبھالا نہ گیا تو اس کا ردعمل شروع ہوا اور آخر کار قوم کو ایک دوسری انتہا تک لے گیا۔ بدقسمتی سے ہم اس بلند چوٹی کو عبور کرنے کے بعد اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ ہم لڑکھڑا کر گرے اور دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ہمارے قومی خمیر میں بتدریج کچھ ایسے منفی عناصر جمع ہو گئے جو نتائج کے اعتبار سے تباہ کن ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ ان میں قومی حوالے سے سب سے نمایاں چیز قومی عصبیت کی جگہ علاقائی عصبیت کا فروغ تھا۔ جس کے نتیجے میں صرف ربع صدی میں بنگلہ قومیت کی بنیاد پر ہمارا ایک حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو گیا۔

تحریک پاکستان کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ ملی بنیادوں پر ایک قوم کی تشکیل اور اس کے لیے جغرافیہ کے حصول کا عمل تھا۔ اس عمل کے بنیادی محرکات دو تھے: ایک اسلام سے وابستگی اور دوسرے ہندو اکثریت کا خوف۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی دوسرا محرک جو زیادہ قوی تھا، ختم ہو گیا، جبکہ پہلے محرک کا شعور ابھی اتنا مضبوط نہ ہوا تھا کہ تنہا ایک نئی قوم کی تعمیر کر سکتا۔ اسلام کی واحد مشترکہ اساس جس پر پاکستانی قوم کی تعمیر و تشکیل کی جانی تھی، اس کا گہرا شعور مسلم اکثریت کے ان علاقوں جن میں پاکستان قائم ہوا، موجود نہ تھا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کے مسلمان تعمیر ملت کے اس پورے عمل میں شریک ہی نہیں تھے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

مسلم سلطنت کے آغاز ہی سے مسلم اقتدار کا مرکز ان علاقوں میں رہا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ مسلمانوں نے وہیں عروج حاصل کیا، وہیں زوال آشنا ہوئے اور تعمیر ملت کا کام شروع ہوا تو اس کا مرکز بھی وہی علاقے رہے۔ مسلم اکثریت کے علاقے ہندوستان کے وہ سرحدی صوبے تھے جہاں ابتدائی دور میں اہل علم و فضل اور مہاجرین کی آمد کے نتیجے میں اسلام تیزی سے پھیل گیا، مگر بعد میں یہ علاقے، مسلم سلطنت کا مرکزی حصہ نہ ہونے کی بنا پر، اہل علم و فضل کا مرکز نہ رہے اور نہ یہاں کے

لوگوں کی تربیت ہوسکی۔ خصوصاً بعد کے ادوار میں جب مجدد الف ثانی کے بعد سے ملی تشخص اور اسلامی حمیت کا ایک گہرا احساس نمایاں ہوکر سامنے آنے لگا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد شہید کے ساتھ جو کچھ ہوا، ایک مسلم اکثریتی علاقے میں ہی ہوا۔

مزید براں یہ کہ ان علاقوں میں جاگیرداری اور قبائلی طرز زندگی کی گرفت بہت مضبوط رہی ہے۔ جاگیردار اور قبائلی سرداروں کو یہ گوارا نہیں کہ ان کے زیر دست علاقوں میں کسی قسم کا بھی شعور عام ہو، خواہ وہ اسلامی شعور ہی کیوں نہ ہو۔ عوام کے بے شعور رہنے میں ہی ان کا مفاد وابستہ ہے۔ بدقسمتی سے شہری علاقوں کے مقابلے میں ان کی اکثریت ہے، اس لیے قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہ لوگ ملک کے سیاسی منظر نامے پر چھائے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں قوم کی تعمیر و تشکیل کے لیے دو چیزوں کی موجودگی لازمی تھی: ایک یہ کہ سیاسی قیادت کے پاس قومی تعمیر کا واضح نقشہ موجود ہو، مگر معاملہ یہ تھا کہ پاکستان اتنی جلدی میں بنا کہ تعمیر قوم کا کوئی نقشہ سامنے تھا نہ اسے بنانے کا وقت کسی کے پاس تھا۔ تحریک پاکستان کی بنیاد جذبات پر رکھی گئی تھی۔ مثلاً اسلام کے نفاذ کا جذبہ، ہندوؤں اور انگریزوں سے نجات کا جذبہ۔ تاہم قوم کی تعمیر جذباتیت پر نہیں، ٹھوس منصوبہ بندی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ بالخصوص قوم کے مختلف گروہوں کے حقوق و فرائض کا مسئلہ بڑا اہم ہوتا ہے، مگر پاکستان حاصل کرنے والی قیادت کے پاس اتنا وقت نہیں تھا اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ فطری یا غیر فطری موت کے بعد ایسی قیادت کے لیے جگہ خالی کر گئی جو انتہائی نا اہل، کم حوصلہ اور مفاد پرست لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ قومی تعمیر کا صبر آزما کام کیا کرتے جو ایک فالج زدہ گورنر جنرل کو سیاسی عمل میں بے جا مداخلت سے نہ روک سکے۔

دوسری چیز جس کی عدم موجودگی صورت حال کو سنگین کرنے کا سبب بنی، وہ اسلامی بنیادوں پر قومی شعور اور ثقافت کی تشکیل تھی۔ جس طرح ہماری سیاسی قیادت قومی تعمیر کے معاملے میں ناکارہ ثابت ہوئی، اسی طرح ہماری مذہبی اور فکری قیادت اس میدان میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی، بلکہ یہ لوگ تو اس کام کی اہمیت کا ادراک بھی نہ کر سکے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں نے قوم کے بجائے آئین کو اور اصلاح کے بجائے اقتدار کو اپنی منزل بنالیا۔ یہ لوگ اگر مثبت بنیادوں پر قوم کی تربیت شروع کر دیتے تو قیام پاکستان کے ربع صدی بعد ہماری تاریخ میں ۱۹۷۱ء نہیں آتا، بلکہ قوم کی تعمیر و شناخت کا مرحلہ بہت جلد دور ترقی و استحکام میں تبدیل ہو جاتا، مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا۔ ملی احساس کو جب شعوری بنیادیں میسر نہ ہوئیں تو قومی یکجہتی مدھم پڑنے لگی۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کی کوتاہ بین سیاسی قیادت نے بنگالی اکثریت میں شدید احساس محرومی پیدا کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوم اور جغرافیہ، دونوں تقسیم ہوگئے۔ سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں ہماری قومی عصبیت کے پرخچے اڑ گئے۔ وہ عصبیت جس کے بغیر کوئی قوم دنیا میں سرفرازی حاصل نہیں کرسکتی۔ بدقسمتی سے سیاسی، مذہبی اور فکری طبقات اپنی پرانی روش پر ابھی تک گامزن ہیں، اس لیے بچے کھچے پاکستان میں بھی قومی عصبیت کے بجائے صوبائی اور لسانی عصبیت غالب ہے اور یہ رجحان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

مغربیت اور اسلام پسندوں کی کشمکش

قومی زندگی کے ساتھ مزید حادثہ یہ ہوا کہ مغرب پسند اشرافیہ اور سیاسی قیادت کا ٹکراؤ فکری اور مذہبی قیادت سے شروع ہو گیا۔ان کے ٹکراؤ سے نہ صرف قومی تعمیر وترقی کا عمل متاثر ہوا، بلکہ ہمارے قومی مزاج میں دو انتہائی تباہ کن رجحانات داخل ہوتے چلے گئے۔ایک مغربی فکر وعمل کا معاشرے میں نفوذ دوسرے مذہبی جمود اور انتہا پسندی کا فروغ۔یہ بات چونکہ بڑی اہم ہے،اس لیے ہم اس کی ذرا تفصیل بیان کرنا چاہیں گے۔

تحریک پاکستان میں اسلام کا نعرہ لگنے سے ہماری مذہبی قیادت کو یہ خیال ہوا کہ یہاں کے عوام اجتماعی زندگی میں اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔دوسری طرف اقتدار ایسے مغرب پرست لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو نفاذ اسلام کی اہلیت رکھتے ہیں اور نہ اس میں مخلص ہیں۔چنانچہ اقتدار ان سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔بدقسمتی سے ان دونوں باتوں سے متعلق بعض اہم پہلو ان کی نظر میں نہ رہے۔یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے مقتدر طبقات ذہناً مغرب سے مرعوب تھے اور ہیں،مگر اسلام کا جو تصور مذہبی طبقات پیش کرتے رہے،اس سے متعلق بعض حقیقی سوالات تھے جن کا مدلل اور تسلی بخش جواب دینا اہل مذہب کی ذمہ داری تھی جسے پورا کیے بغیر انھیں مغرب کی ذہنی غلامی سے نکالنا ممکن نہ تھا۔اس کے بجائے ہمارے اہل علم نے مغربی معاشرے کے بعض منفی پہلوؤں کو اجاگر کر کے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ انھوں نے مغرب زدہ اشرافیہ پر اتمام حجت کر دیا ہے۔حالاں کہ یہ روش دانائی ہی کے نہیں خیر خواہی کے بھی اس جذبے کے خلاف تھی جو پیغمبرانہ دعوت کا شیوہ رہا ہے۔دوسری طرف عوام کے بارے میں بھی ان کا اندازہ درست نہ تھا۔ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عوام الناس کی تربیت نہ ہونے کی بنا پر اسلام سے ان کی وابستگی جذبات کی حد تک تھی اور ان کا اسلامی شعور بہت پختہ نہ تھا۔مزید یہ کہ صرف مذہبی بنیادوں پر دینی قیادت کو سیاسی اقتدار دینا اس قوم کی روایت نہ تھی۔چنانچہ انھیں مؤثر عوامی تائید نہ مل سکی۔اقتدار کے سرچشموں کو بھرپور عوامی تائید کے بغیر ہٹانا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ان حقائق کو نظر انداز کر کے مغرب زدہ اشرافیہ کے خلاف محاذ قائم کر لیا گیا۔جس کے نتیجے میں ایک بے فائدہ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔

اہل مذہب کی پالیسی شروع دن سے یہ رہی کہ دستور کی سطح پر اسلامی احکامات کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔وہ بھول گئے کہ قوم دستور سے نہیں، بلکہ دستور قوم سے بنتا ہے۔بہر حال آئین کی کاغذی سطح پر مغرب زدہ اشرافیہ نے اسلام کی رسمی موجودگی کو گوارا تو کر لیا،لیکن معاشرتی سطح پر انھوں نے خواتین کے حقوق اور پردہ وغیرہ کے عنوانات سے بعض مباحث چھیڑ دیے۔تاہم میڈیا کی طاقت نہ ہونے کی بنا پر ان کے اثرات زیادہ نہ بڑھ سکے۔دوسرے یہ کہ ان کا جواب دینے کے لیے علما نے ایک بھرپور اور منظّم علمی تحریک چلائی جس نے ان کے تھوڑے بہت اثرات کو بھی غیر مؤثر کر دیا۔ایوب خان کے دور میں قانون کی سطح پر کچھ ایسے اقدامات کیے گئے جو رائج اسلامی تصورات سے بعید تھے،تاہم عوام میں مغربیت کے نفوذ کی کوئی کوشش ابھی

تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ دوسری طرف دستوری سطح پر اسلام کی اہمیت کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ یہ صورت حال آج کے دن تک برقرار ہے۔اس کے دوتین اسباب ہیں: ایک تو تحریک پاکستان کا پس منظر، دوسرے عوام الناس کی اسلام سے جذباتی وابستگی اور تیسرے یہ حقیقت کہ بہرحال ہماری اشرافیہ نظریاتی طور پر ہی سہی اسلام کے دین حق ہونے کی قائل ہے۔اس کی ایک نمایاں مثال غلام احمد پرویز صاحب کا اشرافیہ میں نفوذ تھا۔ پرویز صاحب کا نقطۂ نظر ایک جملے میں اگر بیان کیا جائے تو وہ اس طرح ہے کہ ہر حقیقت قرآن کی بارگاہ میں سجدہ کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب کبھی قرآنی بیانات اور مغربی مسلمات میں ٹکراؤ ہوتا تو وہ اپنی مخصوص لغت کی مدد سے قرآن کو مغربی افکار کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان کے خیالات دراصل اشرافیہ کے اس ذہن کے عکاس تھے کہ اسلام حق تو ہے، مگر اس کی کوئی ایسی بات قابل قبول نہ ہوگی جو مغربی اقدار و روایات کے خلاف ہو۔ چنانچہ اسلام کی وہ تعبیر ہماری اشرافیہ کو بڑی پسند آئی جس میں اسلام کے حق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں تھا، مگر زندگی کے عملی میدان میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔

تاہم جب ٹی وی کا آغاز ہوا تو صورت حال میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ یہ بات اب ریکارڈ پر آچکی ہے کہ مقتدر طبقات کے ذہن میں ٹی وی کو معاشرے میں متعارف کرانے کا پس پردہ مقصد یہ تھا کہ مغربی اقدار کو معاشرے میں رائج کیا جائے۔ٹی وی کو عام ہوتے ہوتے مزید دس سال بھٹو صاحب کے دور میں لگے۔اس دور میں پوری قوت کے ساتھ ٹی وی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا، تاہم مقتدر طبقات اس معاملے میں ذرا جلدی کر گئے۔ چنانچہ ربع صدی قبل جب وہ کچھ سرکاری ٹی وی پر نشر ہونے لگا جو آج بھی نہیں ہوتا تو ردعمل ہونا لازمی تھا۔ یہی ردعمل آگے بڑھا اور ضیاء الحق کے اسلامی نظام کی صورت میں ظاہر ہوا، جب تحریک پاکستان کے بعد ایک دفعہ پھر اسلام کے نام پر ایک مہم چلائی گئی۔اسی دوران میں ہمارے پڑوس میں ایک دو ایسے واقعات ہوئے جن سے اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کو بہت مہمیز ملی۔ان میں سے ایک ایران کا اسلامی انقلاب تھا اور دوسرا افغانستان میں روسی فوج کے قبضہ کے بعد جہاد کا آغاز۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس دور میں یوں محسوس ہوتا تھا گویا اسلام و مغرب کی اس کشمکش میں مذہبی حلقوں کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی ہے اور مغرب زدہ طبقہ بہت ہی محدود ہو چکا ہے۔تاہم یہی دور مذہبی حلقوں کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی ترکش کا یہ واحد تیر نشانے پر نہ لگا تو لوگوں کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں۔اسلام کے نام پر کیے گئے فلاحی ریاست کے وعدے ہوا ہوگئے۔اسلام کے نام پر جو کچھ وجود میں آیا، اس سے معاشرے میں صرف منافقت کا اضافہ ہوا۔ دستوری، معاشی اور معاشرتی سطح پر جو اسلامی اقدامات کیے گئے، ان میں سے اکثر اسلام کی بدنامی کا باعث بن گئے۔اس صورت حال کے نتیجے میں عوام کا اسلام سے وہ رومانس ختم ہوگیا جس کے لیے انھیں نصف صدی سے تیار کیا جارہا تھا۔

نفاذ اسلام کی ناکامی سے زیادہ بڑا مسئلہ افغان جہاد کی کامیابی نے پیدا کر دیا۔ ہماری مذہبی قیادت کا المیہ ہے کہ یہ بہت سادہ لوگ ہیں۔تحریک پاکستان کی کامیابی سے انھیں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ اہل پاکستان پکے ''اسلامی'' لوگ ہیں جن کے لیے

مذہب سے بڑا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ افغان جہاد کی کامیابی سے انھیں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں نے جہاد کے ذریعے سے ایک سپر پاور کو ختم کر ڈالا ہے۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اب جہاد سے تمام مقبوضہ مسلم علاقوں کو نہ صرف بازیاب کرایا جا سکتا ہے، بلکہ دوسری سپر پاور جواب تنہا سپر پاور تھی، اس کے پرخچے بھی اڑائے جا سکتے ہیں:

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

روس کے خلاف جذبہ یقیناً ہمارا تھا، مگر تلوار مغرب کی۔ جب مغرب ہمارے مدمقابل آیا تو طالبان کے اس المیہ نے جنم لیا جس میں سب نے دیکھا کہ بہت بہادر لوگ بھی ''تلوار'' کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد عراق کے سانحہ نے آخری کیل کا کام کر دیا، تاہم ابھی تک بہت سے لوگ ''مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' پر یقین رکھتے ہیں۔

بہر حال، جہادی اور نظامِ اسلام پر مبنی فکر نے انتہا پسندی کی ایک زبردست لہر کو فروغ دیا۔ قوم میں موجود جذباتی انداز فکر نے، جس کی موجودگی میں تحقیق و تجزیہ کا مزاج جنم نہیں لے سکتا، اس انتہا پسندی کو بہت فروغ دیا۔ ہمارے بہترین دماغ، زندگیاں اور سرمایہ انتہا پسندی کی نظر ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں علمی احیا کا عمل بدترین جمود میں بدل گیا۔ اور اب ان دونوں تجربوں کی مکمل شکست کے بعد بھی اس فکر کے پیش کرنے والے اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں اول یہ کہ ہر سمجھانے والے کا منہ بند کرنے کے لیے ایک بہت آسان راستہ دستیاب ہے، وہ یہ کہ اسے منکر جہاد، منکر اسلام، مغرب کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جان سے مار دینے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ بدقسمتی سے ہمارے اہل علم کو سیرت پاک کے اس پس منظر سے غلط فہمی ہوگئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں ہی عرب پر اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ آپ جیسی جدوجہد کر کے ہم بھی اقتدار حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کا غلبہ ممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک اجتہادی خطا تھی۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے بیان کیا ہے کہ یہ دراصل رسولوں کے باب میں خدا کا قانون تھا جو عام قوانین کو معطل کر کے حرکت میں آیا تھا۔ جس میں اتمام حجت کے بعد تمام تر بے سروسامانی کے باوجود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی قوم کے خلاف کامیابی یقینی تھی، حتیٰ کہ اپنے معاصرین کے خلاف صحابۂ کرام اور بنی اسرائیل کے جہاد کی نوعیت بھی ہم نے واضح کر دی کہ یہ بھی آسمانی رہنمائی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور ختم نبوت کے بعد اس طرح کے جہاد کا دروازہ بھی بند ہو گیا ہے۔

یہ تو مذہبی انتہا پسندی کی کہانی تھی۔ دوسری طرف نوے کی دہائی شروع ہوئی تو تاریخ کا ایک عظیم انقلاب آیا، یعنی انفارمیشن ایج کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں دنیا حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی گاؤں بن گئی۔ مغرب کی تہذیب جو سوویت یونین کے خاتمے اور گلف وار میں اپنی فتح کے بعد خود اعتمادی کے نشے سے چور تھی، دنیا میں اپنے سیاسی، معاشی اور سب سے بڑھ کر تہذیبی و فکری غلبہ کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ تادم تحریر اسے تینوں محاذوں پر شان دار کامیابی نصیب ہو رہی ہے۔ حالات یہ

بتا رہے ہیں اور جائزے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ان کے سیاسی اور معاشی غلبے پر تو اہل اسلام اور دیگر لوگوں کو کچھ تشویش ہے، مگر ان کے تہذیبی غلبے کو سب لوگ خوش دلی سے قبول کررہے ہیں۔

پیو گلوبل ایٹیٹیوٹ پراجکیٹ سروے کے مطابق ایک امریکی ادارے نے دنیا کے ۴۴ ملکوں کے ۳۸ ہزار افراد کے انٹرویو کیے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پوری دنیا خاص طور پر مسلم ممالک میں امریکا مخالف جذبات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ سروے کے مطابق پاکستان کے ۶۹ فی صد لوگ امریکا سے نفرت کرتے ہیں جو کہ دنیا بھر میں دوسرے نمبر پر ہے۔ ہم جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جائزے کے مطابق اس نفرت کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد امریکی ٹی وی، فلمیں اور موسیقی پسند کرتے ہیں۔ یہ جائزہ نہ بھی ہوتا تب بھی پاکستان کی حد تک ہم میں سے ہر باخبر شخص اس رجحان سے اچھی طرح واقف ہے کہ کس طرح امریکی فلمیں اور موسیقی ہمارے ہاں پسند کی جاتی ہے۔ امریکی فاسٹ فوڈ اور مشروبات ہمارے ہاں بے انتہا مقبول ہیں۔ ان کے تنگ و مختصر لباس ہمارے مردوں سے گزر کر عورتوں میں بھی عام ہو رہے ہیں۔

ہمارا مقصود اس حقیقت کا بیان ہے کہ اگر امریکا اور مغرب کو سیاسی اور معاشی میدان میں شکست ہو گئی، گو اس کے امکانات بہت روشن نہیں، تب بھی ان کا تہذیبی غلبہ بغیر کسی نمایاں مزاحمت کے دنیا بھر میں بشمول پاکستان پھیلتا رہے گا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وی سی آر کے بعد پہلے ڈش اور اب انٹرنیٹ اور کیبل کے ذریعے مغربی افکار و خیالات اور اقدار و روایات ہمارے معاشرے میں علانیہ ہجوم کر رہے ہیں اور کامیابی سے ہمارے گھروں کو فتح کر رہے ہیں۔ دوسری طرف مغرب کی تہذیبی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہندوستانی میڈیا نیز خود ہماری اشرافیہ اور میڈیا کے لوگ مغربیت کو ہمارے گھروں میں ہماری زبان میں پھیلا رہے ہیں۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرہ مغربی تہذیب سے مفتوح ہونے کے قریب ہے۔ اہل مغرب نے اپنے دور حکومت میں ہماری اشرافیہ کے اذہان کو تسخیر کیا تھا۔ اب لگتا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ، ایک محدود اقلیت کو چھوڑ کر، ان کے رنگ میں رنگنے کے لیے تیار ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اہل مغرب کی نقالی ان کی تہذیب اور کلچر کے اعتبار سے تو کرنے کے لیے مستعد ہیں، مگر اجتماعی زندگی کے بارے میں ان کی ذمہ دارانہ روش اور اخلاقی خوبیاں اخذ کرنے کے معاملے میں بالکل پیچھے ہیں۔ وہ بے شک مادہ پرست ہیں، مگر ان کی اکثریت اجتماعی معاملات میں اعلیٰ اخلاقی روش کی پابند ہے، مگر ہم اسلام کے نام لیوا ہونے کے باوجود اجتماعی اخلاقیات کے بارے میں ہر سطح پر بدترین روش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مسلم قوم کی عصبیت کے خاتمے، انتہا پسندی اور مغربیت کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہ اخلاقی انحطاط، بلاشبہ قومی سطح پر ہمارا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔

کیا کوئی امید باقی ہے؟

پہلے باب میں عروج و زوال کے محرکات کے حوالے سے ہم نے جن عناصر کا ذکر کیا تھا، ان میں سے دو غیر اختیاری

تھے: اول یہ کہ قوم کی توانائی ــــــ جس کا انحصار کسی قوم کے مرحلۂ زندگی پر ہوتا ہے ــــــ کس مقام پر ہے؟ دوسرا یہ کہ قوم کو آیا کوئی چیلنج درپیش ہے؟ اگر ہے تو اس کی شدت کتنی ہے؟ اہل پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ یہ دونوں غیر اختیاری عناصر ان کے حق میں ہیں۔ پاکستانی قوم خارج کی طرف سے مسلسل ایک چیلنج کا شکار ہے، مگر یہ چیلنج کبھی اتنا نہیں بڑھا کہ ہماری کمر توڑ ڈالے۔ دوسری طرف ہماری قوم چونکہ ابھی اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں ہے، اس لیے اس میں قدرتی توانائی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔

جہاں تک عروج وزوال کے اختیاری محرکات کا سوال ہے، بدقسمتی سے یہ مکمل طور پر ہمارے خلاف جاتے ہیں۔ جدید علوم اور تعلیم میں ہم دنیا بھر سے پیچھے ہیں۔ اخلاقی معاملات میں ہمارا رویہ انتہائی پست ہے۔ سب سے بڑھ کر ہم نے خدا سے ایک عہد باندھا اور اس کے بعد من حیث القوم بدترین منافقت کا ثبوت دیا ہے۔ ہم حکومت واقتدار کی سطح پر تو مقتدر طبقات پر مغربیت کا الزام ڈال کر بری ہو جاتے ہیں، مگر ہمارے اپنے گھروں اور ذاتی زندگی میں توحید وشریعت کو بے وقعت کرنے کے جرم میں ہم سب شریک ہیں۔ ہمارے قومی کردار میں متعدد ایسی چیزیں شامل ہو چکی ہیں جس کے بعد ہم اپنے اوپر عائد ہونے والی اسلامی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ہماری کوتاہیاں کسی ایک طبقے کی نہیں، بلکہ قوم کا ہر گروہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ہماری اشرافیہ اور حکمران طبقے کا ذہناً اس قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں سے اکثر مغربی افکار کے پروردہ ہیں جن کی تہذیب، ثقافت، اقدار، زبان اور مفادات، سب اس قوم سے جدا ہیں۔ جب تک ہندوؤں کا سامنا تھا یہ لوگ اسی قوم کا حصہ تھے، مگر اس کے بعد ان کے مفادات ان پر ہر چیز سے زیادہ حاوی ہو چکے ہیں۔ یہی حال ہماری سیاسی قیادت کا ہے جو مخصوص طبقات کے مفادات کی محافظ بن کر رہ گئی ہے۔ سیاست دانوں میں جہاں اخلاص ہے، وہاں دور اندیشی اور حکمت کا فقدان ہے اور جہاں فہم و دانائی ہے، وہاں ذاتی مفاد ہر شے پر حاوی ہے۔ ہماری مذہبی قیادت، الاّ ماشاء اللہ، جمود اور فرقہ واریت کی اسیر ہے۔ ہمارے عوام الناس کا قومی مزاج ان تمام بیماریوں سے متاثر ہے جن کی بنا پر وہ دین وشریعت اور اخلاق وفطرت کی عائد کردہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے ادارے شکستہ اور کرپشن کا سب سے بڑا مرکز ہیں۔

ہمارے مستقبل کا تمام تر انحصار اب اس بات پر ہے کہ آیا اس قوم میں کوئی حقیقی فکری قیادت فروغ پا سکتی ہے یا نہیں۔ ہم نے پہلے باب میں عرض کیا تھا کہ قوم کے دو بنیادی حصے ہوتے ہیں: ایک فعال طبقہ جو قیادت اور اشرافیہ پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے غیر فعال عوام الناس۔ قوموں کی راہوں کا تعین پہلا طبقہ کرتا ہے اور اس طبقہ کی رہنمائی فکری قیادت کیا کرتی ہے۔ ہم آج اگر ایک تباہ کن صورت حال کے دہانے پر کھڑے ہیں تو اس کا سبب اسی فکری قیادت سے ہماری محرومی ہے۔ ہمارے قومی حالات کا سب سے منفی پہلو یہی ہے کہ اس وقت ملک میں کوئی حقیقی فکری قیادت موجود نہیں۔ قیام پاکستان کے وقت جو کچھ فکری قیادت تھی، اس کے سر پر سیاست اور اقتدار بری طرح سوار ہو گئے۔ جب فکری قیادت اپنا کام چھوڑ کر سیاسی میدان

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

میں اترتی ہے تو اس کے بعد سیاسی میدان میں کامیابی ملے نہ ملے، وہ اپنے شعبہ میں بڑی حد تک غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ سیاست تو لوگوں کی پسند و ناپسند کی رعایت کر کے ہی کی جا سکتی ہے، جبکہ فکری رہنمائی میں لوگوں کے اوہام و تعصّبات، جذبات و معتقدات اور اعمال و روایات پر تنقید کیے بغیر چارہ نہیں۔ سیاست میں اترنے والوں کو اپنے آدرشوں کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔ یہی ہمارے ہاں بھی ہوا۔ اس کے بعد ہمارے قومی مزاج میں پیدا ہونے والے بعض منفی رجحانات، مثلاً جذباتیت، انتہا پسندی، ظاہر پرستی، اخلاقی انحطاط اور علمی جمود نے کسی حقیقی فکری قیادت کے پنپنے کے امکانات بہت محدود کر دیے۔ جو اکا دکا لوگ موجود ہیں، انھیں اپنی بات کہنے کے بعد جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہم نے اس کتاب کی تیاری کے دوران میں تاریخ کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کیا ہے۔ متعدد قوموں اور تہذیبوں کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد اہل پاکستان کے جو حالات ہمارے سامنے ہیں، انھیں دیکھ کر ہم پر بار بار مایوسی طاری ہو جاتی ہے۔ اندھیر نگری چوپٹ راج کا جو تماشا یہاں ہر سطح پر صبح و شام نظر آتا ہے، اس کے بعد کوئی امید کرنا آسان نہیں۔ بالخصوص خدا سے وفاداری کا عہد باندھنے کے بعد منافقت اور غداری کی جو کہانی ہم اپنے اپنے گھروں میں لکھ رہے ہیں، اس کا نتیجہ کبھی بھی اچھا نہیں نکل سکتا۔

ان مایوس کن حالات میں امید کی کوئی کرن اگر موجود ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قوم کے ہر طبقہ میں ابھی تک زندہ لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہر میدان میں نئی قیادت وجود میں آسکتی ہے۔ اس کتاب کے اصل مخاطب وہی لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نفسا نفسی اور خود غرضی کے اس دور میں قوم کے درد میں تڑپتے ہیں۔ جو اپنے نقطۂ نظر کے علاوہ دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو جذباتیت اور انتہا پسندی کے بجاے اصول پسندی کو اپنا معیار بناتے ہیں۔ جو دنیا پرست الحادی تہذیب کے مقابلے میں نبیوں کی تہذیب کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ان کی نگاہ میں ایسا بڑا ہے کہ وہ کسی اور کی بڑائی کو دل میں جگہ نہیں دے سکتے۔ جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح آخری نبی مان چکے ہیں کہ آپ کے بعد کسی اور کی بات کو وہ حرف آخر نہیں سمجھتے۔ جو صحابۂ کرام کی طرح حق پر کسی اور چیز کو ترجیح نہیں دے سکتے اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس قوم کی تباہ حال تقدیر بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی لوگ اس دھرتی پر ہماری واحد امید ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے سامنے ہم تعمیر ملت کا لائحۂ عمل رکھنا چاہتے ہیں۔

پاکستانی قوم کی تعمیر کا لائحۂ عمل

ہمارے نزدیک پاکستانی قوم کی تعمیر نو ایک عظیم کام ہے جسے بہ یک وقت کئی سطحوں پر کرنے کی ضرورت ہے، تاہم اس کا نقطۂ آغاز ان مسائل کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی ہے جو قوم کے عروج و زوال کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اس معاملے میں اگر غلطی ہو جائے تو بڑے سے بڑا عمل کوئی مثبت نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ ہمارے نزدیک ہم بحیثیت قوم زندگی کے جس مرحلے پر ہیں،

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس میں تعمیری عناصر اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ کرنے کا اصل کام صرف قومی مزاج کی اصلاح ہوتا ہے۔ جب قومی مزاج بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے تو ان عناصر کی توانائیاں مضمحل ہو جاتی ہیں یا منفی کاموں میں خرچ ہوتی ہیں۔ اگر ان امراض کو دور کر دیا جائے تو قومی تعمیر و ترقی کا کام کرنے والے لوگ خود بخود پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ہم نے اب تک اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی بنیاد پر ہم قوم کے اجتماعی مزاج کو لگ جانے والے امراض کا ایک تجزیاتی جائزہ پیش کر رہے ہیں، جن سے نجات حاصل کیے بغیر دنیا میں ہمارے عروج کا کوئی امکان نہیں۔ چاہے ان کا تعلق عام اقوام کو لگ جانے والے امراض سے ہو یا امت مسلمہ کو لاحق ہونے والے امراض سے۔ ہمارے نزدیک چار بنیادی بیماریاں ہیں جن کے خلاف ہمیں جنگ کرنی ہوگی۔ ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ توحید سے اعراض

امت مسلمہ کو لگ جانے والا سب سے خطرناک مرض وہ ہوتا ہے جو اسے توحید اور اس کے تقاضوں سے دور کر دے۔ دور قدیم میں یہ فتنہ شرک تھا اور دور جدید میں الحاد نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ ہم پچھلے باب میں اس کی کچھ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔ اس کا مختصر تاریخی پس منظر یہاں بیان کیے دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے اثر سے اہل مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا جو عمل شروع ہوا، وہ عیسائی مذہبی قیادت کی مخالفت کی بنا پر انکار مذہب سے انکار خدا تک جا پہنچا۔ انیسویں صدی میں یہ فکر خیال غالب ہو چکا تھا کہ انسان کو اب خدا کی ضرورت نہیں رہی، تاہم بیسویں صدی میں صورت حال بہت سی وجوہات کی بنا پر تبدیل ہو گئی۔ لوگوں نے جان لیا کہ خدا اور مذہب سے دامن چھڑانا آسان نہیں، لیکن جدید ذہن کے سامنے مذہب کی شکل میں جو کچھ رہنمائی موجود تھی، اسے قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ایک درمیانی راستہ نکالا گیا۔ خدا اور مذہب، دونوں کو قبول کر لیا گیا، مگر دونوں کی حیثیت ایک ثقافتی ورثے کی تھی۔ آج لوگ خدا کو پکارتے، عبادت گاہوں میں جاتے اور مذہبی تہوار مناتے ہیں، مگر ان کی حیثیت تہذیبی روایات کی سی ہے۔ عملی زندگی میں کوئی بھی مذہب کی رہنمائی قبول نہیں کرتا۔

ہمارے نزدیک یہ رویہ صرف دنیا کی زندگی کو مقصود بنانے سے پیدا ہوتا ہے۔ توحید ایک نامکمل عقیدہ ہے جب تک اس کے ساتھ آخرت کا جوڑ نہ لگایا جائے۔ اس دنیا میں چونکہ انسان کو آزمایش کے لیے بھیجا گیا ہے، اس لیے خدا ہمیشہ اپنے آپ کو پردۂ اسباب میں مستور رکھتا ہے۔ یہ پردہ روز قیامت اٹھایا جائے گا جہاں خدا اپنی تمام تر صفات کے ساتھ لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا۔

اہل مغرب میں اگر یہ رویہ پایا جاتا ہے تو کوئی عجیب بات نہیں، کیونکہ جو مذہبی رہنمائی وہاں موجود ہے، اس میں بھی عقیدۂ آخرت کا تصور نہایت مبہم اور نامکمل ہے، مگر جب مسلمان یہ کام کرتا ہے تو وہ ایک بدترین جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس لیے کہ اسلام میں آخرت پر اتنا ہی زور دیا گیا ہے جتنا کہ توحید پر۔ مگر دنیا پرستی کی مغربی لہر جب یورپ سے نکلی اور چار عالم میں پھیلی تو مسلمان بھی اس سے اسی طرح متاثر ہوئے، جس طرح بنی اسرائیل شرک سے متاثر ہوئے تھے۔ آج ہمارے دلوں میں بھی دنیا کی محبت اس طرح رچ بس گئی ہے کہ ہم اپنی تمام تر دینی ذمہ داریوں اور اخروی جواب دہی کو فراموش کر گئے ہیں۔ ہمیں دنیا کے سامنے توحید کا علم بلند رکھنا تھا، مگر ہمارا حال یہ ہو چکا ہے کہ خوف وخواہش اور امید واندیشہ کا ہر جذبہ اسی دنیا اور دنیا والوں سے وابستہ ہو چکا ہے۔ ہمارا رونا اور ہنسنا، لینا اور دینا، بیٹھنا اور اٹھنا دنیا کی زندگی کے لیے ہے۔ ہر وہ مقام جہاں خدا کی جنت اور دنیا کے فائدہ میں سے کسی ایک کا انتخاب ہمارے سامنے آتا ہے، بلا جھجک ہمارا انتخاب دنیا اور اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ خدا نے اپنی جنت پانے کے جو شرائط مقرر کیے ہیں، ان کے حساب سے جنت وہی پائے گا جو قربانی کے درجے میں اس کے لیے محنت کرے، ہم لوگ تو خواہش کے درجے میں بھی جنت کے طلب گار نہیں۔ ہم تو بس مال و دنیا کے طلب گار بن کر رہ گئے ہیں۔ گاڑی، بنگلہ، اسٹیٹس، بینک بیلنس اور مال و دنیا کے دیگر مظاہر ہمارے مالک وآقا بن چکے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔

دنیا کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد کسی مسلم گروہ کے لیے خدا پرستی کی وہ زندگی گزارنا ممکن نہیں رہتا جو سرتا سر قربانیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ امت مسلمہ کے ساتھ زیادہ بڑا سانحہ یہ ہوتا ہے کہ توحید چھوڑنے کے بعد خدا انھیں اجتماعی سطح پر دنیا میں بھی کچھ نہیں دیتا۔ ان پر ذلت و رسوائی مسلط کر دی جاتی ہے۔ عارضی طور پر جو دنیوی فراخی انھیں حاصل ہوتی ہے، وہ جلد یا بدیر کسی سزا کے بعد چھین لی جاتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عصر حاضر میں توحید سے ہمیں دور کرنے والا دوسرا عنصر شرک ہے۔ گو صحابۂ کرام کی قربانیوں کے نتیجے میں نظری طور پر شرک مر چکا ہے اور کوئی بھی اس احمقانہ نظریے سے وابستگی کو درست ثابت نہیں کر سکتا اور نہ کرتا ہے، لیکن غیر اللہ کو خدا کا مقام دینے کا مرض بہر حال آج بھی عام ہے۔ یہ علم وعقیدہ، دونوں کی سطح پر ہوتا ہے۔ عقیدہ کی عوام الناس میں جو گمراہی پھیلی ہوئی ہے، اس سے اکثر لوگ واقف ہیں اور اس پر بہت تنقید ہو چکی ہے۔ ہم اس مرض کی طرف توجہ دلانا چاہیں گے جو علمی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ عام زبان میں اسے اکابر پرستی کہتے ہیں۔ وہ اہل علم، بزرگ اور صالحین جنھیں ان کے ہم عصر اپنے جیسا جانتے تھے، وقت کی گرد، ان کی صورت گری اس طرح کرتی ہے کہ آنے والے عزت وشرف اور علم و بزرگی کا ہر وہ تاج ان کے سر پر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو صرف اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیب دیتا ہے۔ اس کے بعد ان سے اختلاف کرنا ایک جرم بن جاتا ہے۔ اسلاف سے اختلاف کرنے والوں کو لوگ بلا جھجک رد کر دیتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے دور کا ایک ''معمولی'' انسان ان سراپا علم وعظمت ائمہ سے اختلاف کی جرأت کیسے کر سکتا ہے۔ کاش، لوگ یہ جانتے کہ جس معاشرے میں عدم برداشت فروغ پا جائے، وہ ذہنی طور پر مردہ اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔

دنیا پرستی اور اکابر پرستی کے یہ امراض جو راہ توحید کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور بد قسمتی سے ہمارے قومی وجود کا پوری

طرح احاطہ کیے ہوئے ہیں، ان کا واحد علاج قرآن کی براہ راست رہنمائی ہے۔ شرط یہ ہے کہ قرآن پڑھتے وقت صرف قرآن پڑھا جائے۔ بغیر کسی تفسیر کے جب خالی الذہن ہو کر قرآن پڑھا جائے گا تو جو بنیادی پیغام بار بار سامنے آئے گا، وہ یہ ہوگا: ''لوگو، تمھارا رب ایک ہی ہے اور وہی ہر بڑائی اور عظمت کا واحد مستحق ہے۔ وہ اپنی تمام تر صفات کے ساتھ ہر آن تمھارے ساتھ ہے۔ تمھیں ایک روز اس کے حضور پیش ہو کر تنہا اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ جہاں اس کے فرماں بردار جنت میں اور نافرمان جہنم میں جائیں گے۔''

اس فکر کے ساتھ جینے والا کبھی دنیا پرست ہو سکتا ہے نہ اکابر پرست۔ اس ذہن کے ساتھ دھرتی پر چلنے والا خدا کا بہترین بندہ اور انسانوں کے لیے ایک فائدہ مند وجود ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اس معاشرے میں سب سے کم ہو گئے ہیں۔

۲۔ ظاہر پرستی

امت مسلمہ کو لگنے والا دوسرا مرض وہ ہے جو شریعت کو اس کے لیے بے وقعت بنا دیتا ہے۔ یہ مرض ظاہر پرستی کا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ معنوی حقائق کو براہ راست سمجھنے کی کامل استعداد نہیں رکھتا۔ چنانچہ ان معنوی حقائق کو اس کے ذہن میں تازہ رکھنے کے لیے خدا کی شریعت کچھ ظواہر کو استعمال کرتی ہے۔ مثال کے طور پر خدا کی یاد تو ہر حال میں انسان کے دل و دماغ میں زندہ رہنی چاہیے، لیکن چونکہ انسان بھول جانے کی ایک مستقل صفت اپنے اندر رکھتا ہے، اس لیے نماز کو خدا کی یاد کے لیے ہر شریعت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ نماز خدا کی مقرر کردہ ہے، اس لیے ہر حال میں قابل اتباع چیز ہے، مگر ایک ظاہر پرست ذہن سے نماز کی یہ اصل کہ نماز کا مقصد خدا کی یاد دہانی (طٰہٰ ۲۰: ۱۴) ہے تو محو ہو جاتی ہے اور اس کا تمام تر دھیان نماز کی ظاہری ہیئت اور اس کی جزئیات کی طرف ہو جاتا ہے۔ جزئیات میں چونکہ اختلاف کی گنجایش رہتی ہے، اس لیے تفرقہ بازی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد صرف اس بات پر کسی شخص کے کفر و ایمان کا فیصلہ صادر ہوتا ہے کہ اس نے ''رفع یدین'' کیا یا نہیں۔ اور بعض اوقات اس بات پر ایک نئی مسجد بنا دی جاتی ہے کہ جماعت کی تکبیر میں کس وقت کھڑا ہونا چاہیے۔ یہ رویہ بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ دین کی ہر چیز اختلافی ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ ظاہر فرقہ پرستی فرقہ بندی کا بنیادی سبب بن جاتی ہے، جس کے بعد امت مسلمہ کے افراد اپنی شناخت مسلمان کے بجائے ان ناموں سے کراتے ہیں جن سے اللہ اور رسول کا کوئی تعلق نہیں۔

یہی ظاہر پرستی ہے جس کے نتیجے میں لوگ دین کے نام پر شرعی احکام میں فروعی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں اور اس کے بعد انھیں اصل شریعت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہم دین میں فقہی احکامات کے مخالف ہیں، نہ اس کی اہمیت سے بے خبر۔ فقہ زندگی کی لازمی ضرورت ہے جس کا انکار کوئی ناواقف شخص ہی کر سکتا ہے۔ ہمارا اعتراض صرف اس رویہ پر ہے جس میں فقہ کو شریعت میں ملا کر اس کے برابر یا اس سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ خدا کی شریعت جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہے، بہت مختصر ہے۔ یہ صرف انھی احکام کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے جہاں انسانی عقل پہنچنے سے عاجز ہے۔ مثلاً عبادات جن میں انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ خدا کی عبادت کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ چنانچہ شریعت نے عبادات کو موضوع بنایا اور اس سلسلے میں تفصیلی احکامات دیے۔ اسی طرح وہ مقامات جہاں عقل انسانی ٹھوکر کھا جاتی ہے، وہاں بھی شریعت نے اس کی رہنمائی کی ہے۔ مثلاً معاشرتی معاملات میں زن وشو کے حقوق وفرائض یا معاشی میدان میں سود کی حرمت وغیرہ۔

تاہم ایک محدود دائرے کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزاد چھوڑا ہے کہ وہ اپنے حالات کے اعتبار سے اپنی زندگی کے معاملات میں جو چاہے قانون سازی کرے، تاہم یہ قانون سازی ایک انسانی کام ہے۔ یہ مقدس نہیں ہے۔ اس میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ یہ سب باتیں صرف اس وقت واضح ہوں گی، جب یہ حقیقت ذہن میں رہے کہ اصل شریعت اس قانون سازی سے بلند چیز ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں دے کر گئے ہیں۔ جس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ جو اجتہاد کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن جب یہ بات لوگوں پر واضح نہیں ہوتی تو مقدس شریعت میں انسانی قانون سازی کا پیوند لگاتے ہیں اور اسی کو دنیا کے سامنے دین حق کے نام پر پیش کرتے ہیں۔ جب انسانی کاموں پر بعض اعتراضات سامنے آتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ گویا شریعت پر اعتراض ہو رہا ہے۔ جس کے بعد ایک طرف تو معترضین کی تکفیر کی جاتی ہے اور دوسری طرف فقہی کام کے دفاع میں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں ضائع کی جاتی ہیں۔ انفارمیشن ایج میں کھڑے ہو کر ایگریکلچرل ایج کے انسانی کام کے دفاع کے نتائج اکثر یہ نکلتے ہیں کہ لوگوں کی نگاہوں میں پورا دین ہی بے وقعت یا ناقابل عمل ہوجاتا ہے، اور بدقسمتی سے یہی اس وقت ہو رہا ہے۔

ظاہر پرستی کا ایک اور اثر اخلاقی حالت پر پڑتا ہے، جسے ہم آگے ''اخلاقی پستی'' کے عنوان کے تحت بیان کریں گے، تاہم ان سب چیزوں کے ساتھ ظاہر پرستی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ بنیادی حقیقتیں جن کی یاددہانی کے لیے یہ ظاہری عبادات مقرر کی گئی تھیں، لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔ نماز رہ جاتی ہے، مگر خشوع اور خدا کی یاد نہیں رہتی۔ فواحش ومنکرات نماز کے ساتھ زندگی کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ روزے کا اہتمام خوب ہوتا ہے، مگر خدا خوفی کا اہتمام نہیں رہتا۔ زکوٰۃ پابندی سے دی جاتی ہے، مگر دل دنیا کی محبت سے پاک نہیں ہوتا۔ حج وعمرہ کی کثرت ہوتی ہے، مگر خدا کی نصرت اور شیطان سے دشمنی زندگی کا مقصد نہیں بن پاتی۔

ظاہر پرستی کے مرض کی شناعت کو اس کے صحیح تناظر میں اگر سمجھنا ہے تو اس کے لیے تورات اور انجیل کا تقابلی مطالعہ کافی مفید ثابت ہوگا۔ تورات اور انجیل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تورات میں قانون وشریعت کا بیان ہے، جبکہ انجیل شریعت کی اس حکمت کا خزانہ ہے جو ہزار برس میں بنی اسرائیل سے کھو گیا تھا۔ بائیبل چونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا بھی بیان ہے، اس لیے اس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تورات سے ملنے والی شریعت انجیل تک پہنچتے پہنچتے ''تالمود'' کے فقہی انبار تلے دب

چکی تھی۔ چنانچہ سیدنا عیسیٰ کی پوری دعوت کا مرکزی خیال بنی اسرائیل کو ظاہر پرستی سے نکال کر واپس دین کی صحیح حکمت کی روشنی میں واپس لانا تھا۔ آپ نے بنی اسرائیل کی مذہبی قیادت پر اس حوالے سے شدید ترین تنقید کی ہے۔

مثلاً یہودی فقیہوں اور فریسیوں کے اس اعتراض کے جواب میں کہ سیدنا مسیح کے پیروکار بزرگوں کی روایت کے مطابق کھانا کھاتے وقت ہاتھ کیوں نہیں دھوتے؟ آپ نے فرمایا کہ اے ریاکارو، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم خدا کے حکم کے برخلاف والدین سے بدکلامی کیوں کرتے ہو؟ پھر آپ نے اپنے شاگردوں سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی دینی بصیرت پر اس طرح تبصرہ کیا کہ یہ اندھے راہ بتانے والے ہیں۔ فرمایا کہ جو چیز منہ میں جاتی ہے، وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی، بلکہ جو چیز منہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے۔ آدمی بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانے سے ناپاک نہیں ہوتا، بلکہ حرام کاری، چوری، زنا، خوں ریزی وغیرہ سے ناپاک ہوتا ہے۔ (خلاصہ کتاب متی باب ۱۵)۔

ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر جب آپ پر اعتراض کیا گیا تو آپ نے انتہائی تلخ جواب دیا کہ تم لوگ پیالے اور رکابی کو تو اوپر سے صاف کرتے ہو، لیکن تمھارے اندر لوٹ اور بدی بھری ہوئی ہے۔ اس پر شریعت کے ایک عالم نے کہا کہ ایسی باتوں سے آپ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ اے شرع کے عالمو، تم پر بھی افسوس! کہ تم ایسے بوجھ کو جن کو اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور خود ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔ (خلاصہ کتاب لوقا باب ۱۱ آیات ۳۷ تا ۴۶)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدنا مسیح سے ظاہری اعمال کی اہمیت پوشیدہ نہ تھی، مگر اس دور میں جس طرح بنی اسرائیل کی مذہبی قیادت ظاہر پرستی کا شکار ہو چکی تھی، اس میں بہت کم اہمیت کے ظاہری اعمال کے پیچھے دین کی تمام بنیادی حقیقتیں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ چنانچہ آپ ہر اعتراض کے جواب میں ان کی توجہ ان کے ایسے رویوں کی طرف مبذول کرا دیتے جن میں وہ زیادہ بنیادی باتوں کی خلاف ورزی کر رہے ہوتے۔ آپ نے شریعت کو منسوخ نہیں کیا، بلکہ آپ اس کی تکمیل کے لیے آئے تھے (کتاب متی باب ۵: ۱۷) یعنی احکام کی حکمت و مقام واضح کرنے کے لیے۔ آپ نے اپنی تعلیمات میں ظاہری چیزوں کے مقابلے میں احکام کی حقیقت اور ترجیحات کو واضح کرنے پر زور دیا۔ پہاڑی کا مشہور خطبہ اس کی بہترین مثال ہے۔ (کتاب متی باب ۵: ۷)۔

ہم نے اس بحث میں انجیل کے حوالے سے کچھ مثالیں اس لیے دی ہیں کہ سیدنا عیسیٰ کے دور میں یہ مرض بہت بڑھ چکا تھا، اور جب ایک امت مسلمہ اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو دین و شریعت اور ایمان و اخلاق کے ہر حکم سے زیادہ فقہ کا ظاہری ڈھانچا لوگوں کی نگاہوں میں محبوب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پیچھے خدا کے ایک جلیل القدر رسول کے کفر اور قتل کی سازش جیسے اقدامات تک کر لیے جاتے ہیں۔ آج بھی ظاہر پرستی ہمارا عظیم مسئلہ بن چکی ہے۔ فرد سے لے کر حکومت تک صرف ظاہری لیپا پوتی کو اتباع شریعت کا معیار قرار دے دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر معمولی محنت اور قربانی کے بعد

امت میں ’’دین داری‘‘ تو بہت بڑھ رہی ہے، مگر دین دار نہیں بڑھتے۔ پھر اخلاق و معاملات کی ہر چڑھائی پر یہ دین داری جس طرح ساتھ چھوڑتی ہے، اس کے نتائج انتہائی افسوس ناک نکلتے ہیں۔

جب تک اس مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا، ہم کبھی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے جو ایک مسلمان قوم ہونے کے حوالے سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ دین کا صحیح علم لوگوں تک پہنچایا جائے۔ احکام کی ترجیحات اور ان کے مقاصد کا شعور ان میں واضح کیا جائے۔ دین کے اصل مآخذ قرآن وسنت کی بنیاد پر مروج دینی افکار اور روایتی تصورات پر جو شاہ کار اور حکیمانہ تنقید بعض اہل علم نے اس دور میں کی ہے، اسے لوگوں تک پہنچایا جائے۔

۳۔ اخلاقی پستی

کتاب کے پہلے باب میں ہم نے قوموں کے عروج و زوال کے محرکات کے ضمن میں اخلاقی اقدار کی اہمیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے والی اصل چیز اخلاقی رویہ ہے۔ انسان کی عقلی قوت جب تک اس اخلاقی رویہ کے تحت استعمال ہوتی ہے، تمام معاملات ٹھیک رہتے ہیں اور جب اس کے سفلی جذبے اس پر غلبہ پالیں تو نہ صرف اخلاقی وجود سے ملنے والی روحانی توانائی سے اسے محروم کر دیتے ہیں، بلکہ اس کی عقلی استعداد کو بھی آخر کار کند کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

اصل میں انسان ایک معاشرتی وجود ہے۔ معاشرتی زندگی کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر گزرتی ہے۔ انسان کا حیوانی وجود دینا نہیں جانتا، صرف لینا جانتا ہے۔ چاہے اس کا لینا دوسروں کی موت کی قیمت پر ہو۔ یہ اصلاً انسان کی اخلاقی حس ہے جو اپنے حقوق کے ساتھ اپنے فرائض سے بھی انسان کو آگاہ کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کا اصل حسن احسان، ایثار اور قربانی سے جنم لیتا ہے۔ جب تک اخلاقی حس لوگوں میں باقی رہتی ہے، اپنے فرائض کو ذمہ داری اور خوش دلی سے ادا کرنے والے اور ایثار و قربانی کرنے والے لوگ اکثریت میں رہتے ہیں۔ جب اخلاقی حس مردہ ہونے لگے تو ایسے لوگوں کی کمی کے نتیجہ میں خود معاشرہ مردنی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ بدقسمتی سے ٹھیک یہی وہ صورت حال ہے، آج جس کا ہم شکار ہو چکے ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اس معاملہ کی کوئی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال کا مشاہدہ خاندان کے ادارے سے لے کر قومی اداروں تک ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اب جنگل کا قانون رائج ہے جس میں طاقت ور ہر حال میں جیتتا ہے اور کمزور کا مقدر شکست خوردگی کے سوا کچھ نہیں۔ طاقت ور لوگ اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں پر ہر طرح کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ طاقت خواہ مال کی ہو، اختیار کی ہو، علم کی ہو، صلاحیت کی ہو یا کسی اور قسم کی ہمیں بلا جھجک ہر اخلاقی قدر پامال کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ طاقت کے باوجود اخلاقی معیارات کی پابندی کرنے والے لوگ اب استثنائی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال صرف امرا اور مقتدر طبقات تک محدود نہیں ہے، بلکہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اب خاص و عام، سب اس معاملے میں یکساں ہیں۔ ان حالات میں ہم پر فرض کے درجہ میں یہ چیز لازم ہو چکی ہے کہ ہم اس صورت حال کو بدلنے کے لیے جدوجہد شروع کریں۔ ان عوامل کو تلاش کریں جن کی بنا پر یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے، اور اس معاملے میں اپنے لوگوں کی تربیت کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً ہمیں بدترین تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔

انسانی معاشرے میں اخلاقی بگاڑ بلا وجہ نہیں پھیلتا۔ انسان خیر و شر کا اتنا گہرا شعور اپنے اندر لے کر آیا ہے کہ جب تک کچھ غیر معمولی عوامل اس کے اس شعور کو پوری طرح کچل نہ دیں، وہ اخلاقی جرائم سے باز رہتا ہے۔ ہمارے نزدیک ہمارے ہاں اخلاقی بگاڑ کے اس رویے کے پیدا ہونے کے متعدد عوامل ہیں۔ اس کا سب سے بنیادی عامل دنیا پرستی کی وہ لہر ہے جس میں لوگ وقتی مفاد کے آگے ہر چیز کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ دنیا جتنی حسین آج ہے، اتنی کبھی نہیں تھی۔ خصوصاً جن سہولتوں تک ایک عام آدمی کی پہنچ آج ممکن ہے، وہ پہلے کبھی ممکن ہی نہیں رہی، تاہم یہ دنیا بلا قیمت دستیاب نہیں، اس کے حصول کے لیے مال چاہیے۔ چنانچہ مال کمانا اور اس سے دنیا حاصل کرنا اب ہر شخص کا نصب العین بن چکا ہے۔ دوسری طرف یہ مال جائز و ناجائز کی اخلاقی حد میں رہ کر آسانی اور اس وسعت کے ساتھ نہیں ملتا جس سے دنیوی سامان تعیش بہ افراط حاصل کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حصول زر کی دوڑ میں ہر اخلاقی حد کو پھلانگ جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ رویہ ہر معاملے میں انسان کو ظلم پر آمادہ کر دیتا ہے اور پھر پورا معاشرہ فساد سے بھر جاتا ہے۔ اس صورت حال میں وہ نوجوان بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں جو بلند تر آدرشوں کے لیے روپے پیسے کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے، مگر بدقسمتی سے ہمارے ساتھ یہ سانحہ بھی ہو رہا ہے کہ قوم کے نوجوان کی منزل صرف مادی منفعتوں کا حصول بن کر رہ گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اخلاقی انحطاط کی دوسری وجہ اس منفی سوچ کا فروغ ہے جو ہمارے بعض طبقات نے عام کر دی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک صاحبان اقتدار اور اشرافیہ غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ انھیں ہر مسئلہ کے پیچھے یہود و ہنود اور امریکا و روس کی سازشیں نظر آتی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اشرافیہ، مقتدر طبقات اور بیرونی طاقتیں کیا کر رہی ہیں۔ جب یہ روش اختیار کی گئی تو عوام کی تربیت یہ ہوئی کہ ہر خرابی کی جڑ صرف دوسروں میں ہے۔ جب دوسرے ٹھیک ہو جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ اپنی ذمہ داریاں فراموش کرنے لگے۔ ان کی توجہ اپنے دائرے میں عائد ذمہ داریوں سے زیادہ دوسروں کے اس دائرے پر تھی جس میں ان کا کچھ اختیار نہیں۔ چنانچہ نہ بیرونی طاقتوں کی سازشیں ختم ہوئیں، نہ اشرافیہ اور مقتدر طبقات کی اصلاح ہوئی۔ صرف یہ ہوا کہ عوام الناس اپنے اپنے اوپر عائد اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرنے لگے۔ دوسروں کا ہر عیب اپنی غلطی کا ایک عذر بنتا چلا گیا۔ سسٹم کی وہ خرابی جو پہلے بالا دست طبقات تک محدود تھی، اب گھر گھر پھیل گئی۔

اخلاقی انحطاط کا تیسرا بنیادی سبب ظاہر پرستی کا غلبہ تھا۔ فکری طبقات نے عوام کی اصلاح کے بجائے ان کا رخ خارجی بگاڑ پر احتجاج کی جانب موڑا تو ہماری مذہبی قیادت نے دین کے نام پر ظاہر پرستی کے فروغ کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔

خدا پرستی اور اتباع شریعت کا معیار کچھ ظاہری اعمال بن گئے۔ علامتی چیزوں کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا گیا۔ دین کے ظاہری ڈھانچے کو جو اصلاً دین داری کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، دین کا آخری مطلوب قرار دے دیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت کے احکامات سے وابستہ مقاصد جن کا ظہور اخلاقی سطح پر مطلوب تھا، وہ معاشرے کا موضوع ہی نہیں رہے اور نہ کسی کو ان کے پیدا کرنے کی فکر رہی۔ نتیجتاً لوگوں کی اخلاقی حس مردہ ہونے لگی۔ مثلاً نماز سے پیدا ہونے والی خدا کی یاد فواحش و منکرات سے انسان کو روکتی ہے (العنکبوت ۲۹: ۴۵) مگر جب نماز میں خدا کی یاد مطلوب ہی نہیں تو کون بے حیائی اور منکر سے رکے گا؟ چنانچہ ڈاڑھی، ٹوپی، نماز، روزے اور حج وعمرے والا مسلمان بھی آج اسی اخلاقی پستی کا شکار ہے جس کا گلہ ایک دنیادار شخص سے کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقی انحطاط کا چوتھا سبب قومی زندگی میں کسی اجتماعی نصب العین کی عدم موجودگی ہے۔ اخلاقی زندگی صرف اس وقت پروان چڑھتی ہے، جب فرد کسی خارجی دباؤ کے بغیر خود اپنے اوپر کچھ پابندیاں عائد کر لے۔ انسان ایسا اس وقت کرتا ہے، جب اس کے سامنے کوئی بلند مقصد اور نصب العین ہوتا ہے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر کوئی ایسا مقصد ہمارے سامنے نہیں۔ دوسری اقوام اس مسئلہ کو قوم پرستی اور حب الوطنی کے جذبے سے حل کرتی ہیں، مگر ہم ابھی تک اپنی قومی بنیادوں ہی کو متعین نہیں کر سکے۔ فی الوقت ہماری اجتماعیت مغربی، ہندوستانی اور زوال یافتہ مسلم تہذیب اور مقامی ثقافت کا ایک ایسا ملغوبا ہے جس کی کوئی واضح اور متعین شکل پچاس سال میں سامنے نہیں آسکی۔ من حیث القوم ہماری کوئی منزل نہیں اور ہماری قوم پرستی اپنی علاقائی قومیت تک محدود ہے۔ جب یہاں کوئی متفقہ قومی شعور اور کلچر ہی نہیں تو فرد کس قوم کے لیے انفرادی مفاد کی قربانی دے۔

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو ہمارے اخلاقی انحطاط کے پیچھے کارفرما ہیں۔ جب تک ہم ان وجوہات کو دور نہیں کریں گے، اس وقت تک اخلاقی انحطاط کا یہ کینسر ہمیں اندر ہی اندر کھاتا رہے گا اور ایک روز ہمیں کسی بڑی تباہی سے دوچار کر دے گا۔ ہمارے نزدیک اس صورت حال کا حل اس بات میں مضمر ہے جسے ہم نے پچھلے باب میں بیان کیا تھا، یعنی امت مسلمہ کی اخلاقی اقدار کی بنیاد صرف فطرت نہیں رہتی، بلکہ خدا کی براہ راست رہنمائی حاصل ہونے کے بعد یہی رہنمائی ان کی اخلاقی اقدار کی بنیاد بن جاتی ہے۔ وہ رہنمائی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہی ہے کہ توحید کے فروغ کو قوم کا مقصد ہونا چاہیے اور اس کے لیے قوم شریعت پر اس کی صحیح اسپرٹ میں عمل کرے۔

اس رہنمائی کو قبول کر کے مذکورہ بالا چاروں منفی اسباب ختم ہو جاتے ہیں۔ توحید پرست فرد دنیا پرست نہیں ہو سکتا۔ شریعت کی صحیح اسپرٹ ظاہر پرستی کا مرض ختم کر دیتی ہے۔ جنھیں توحید دنیا میں پھیلانی ہو، وہ دوسروں کی ''سازشوں'' کے پرچار کے بجائے ان تک حق پہنچانے میں دل چسپی لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے فرائض انھیں یاد دلانے کے بجائے اپنی ذمہ داریاں یاد رکھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر توحید کی شکل میں قوم کو وہ اجتماعی نصب العین حاصل ہو جاتا ہے جس کے فروغ کا ارفع مقصد قوم

کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔توحید و شریعت سے سچی وابستگی نہ صرف ہمارے اخلاقی مسائل کا حل ہے، بلکہ مغربی الحاد کو دنیا میں جو فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس کے بعد ہم پر آخری درجہ میں فرض ہو چکا ہے کہ ہم خالص توحید اور آخرت کا مشن لے کر میدان عمل میں اتر آئیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو، بلا شبہ ہم بارگاہ احدیت کے مجرم قرار پائیں گے۔

۴۔علمی پس ماندگی

ایک فرد کی طرح جو روزمرہ فرائض ادا کرنے کے لیے غذا کا محتاج ہوتا ہے، ایک قوم بھی اپنی بقا کے لیے توانائی کے ان ذخائر کی محتاج ہوتی ہے جو اس کی ضروریات پوری کر سکیں۔اس کے ساتھ ساتھ جس طرح ایک فرد اپنے وجود کے تحفظ کے لیے کسی چھت کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح قوم کو بھی اپنے دفاع کے لیے طاقت کی ایک چھتری کی ضرورت ہوتی ہے۔دور جدید میں یہ توانائی اور یہ طاقت اب ایک ہی سرچشمہ سے حاصل ہوتی ہے، یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے سے۔سائنس اور ٹیکنالوجی علم کی وہ شاخ ہے جس نے اس دور میں انتہائی غیر معمولی ترقی کی ہے۔جس کے نتیجے میں دنیا زرعی سے صنعتی اور اب انفارمیشن ایج میں داخل ہو چکی ہے۔مغرب چونکہ اس تمام تر علمی ترقی کا امام رہا ہے، اس لیے طاقت اور توانائی میں بھی وہ سب سے آگے ہے، اور مشرق کی کچھ اقوام بھی تعمیر و ترقی کی سیڑھیاں چڑھ رہی ہیں تو اس کا سبب اسی سائنس و ٹیکنالوجی پر ان کی دسترس ہے۔

بدقسمتی سے ہماری قوم اس میدان میں بھی ایک انتہائی ناقابل رشک صورت حال سے دوچار ہے۔دفاعی میدان میں تو ہم نے کچھ تھوڑی بہت طاقت حاصل کر لی ہے، مگر یہ طاقت فطری طریقے پر حاصل نہیں کی گئی، بلکہ بھارت کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے ممالک کے تعاون سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ طاقت اگر سائنس اور ٹیکنالوجی پر اپنے عبور کی بنیاد پر حاصل کی جائے تو اتنی مہنگی نہیں پڑتی، مگر دوسروں سے لینے کی صورت میں منہ مانگے دام دینے پڑتے ہیں۔جس کے نتیجے میں ہماری قومی ترقی دیگر میدانوں میں شدید متاثر ہوتی ہے اور قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوجی اخراجات کی نظر ہو جاتا ہے۔

تاہم سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی تعلیم اور خواندگی کی جن بنیادوں پر ہوتی ہے، وہ ہمارے ہاں انتہائی مخدوش ہیں۔غربت کی بنا پر ہمارے بچوں کی ایک بڑی تعداد پرائمری کی سطح پر بھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتی۔ جاگیرداری نظام تعلیم کو اپنی موت سمجھتا ہے اور اس کے فروغ میں ہر طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔حکومت کی ترجیحات میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا اندازہ قومی بجٹ میں تعلیم کے حصہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ پہلے کیا ہوتا تھا؟ اسے چھوڑیے۔اس سال یعنی ۲۰۰۳ء کے بجٹ میں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مختص رقم میں بالترتیب ۸۰ اور ۲۰ فی صد کے اضافہ کے بعد بھی تعلیم کے لیے مخصوص رقم کل بجٹ کا ایک فیصد بھی نہیں بنتی، یعنی کل ۷.۶ ارب روپے جو قومی بجٹ کا محض ۰.۹۴ فی صد ہے۔ چودہ کروڑ سے زائد آبادی پر اس رقم کو تقسیم کرنے سے فی کس سالانہ تعلیمی بجٹ تقریباً ۵۰ روپے سالانہ یا ۴ روپے ماہانہ بنتا ہے۔

اس صورت حال پر کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے؟

ان حالات میں جتنی کچھ بھی تعلیم ہے، وہ زیادہ تر فنون کی ہے۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کا حال یہ ہے کہ صرف گنی چنی تعداد میں یہاں پی ایچ ڈی ہوتے ہیں۔ ملک کی جامعات میں تحقیق خاص طور پر سائنسی تحقیق کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر ملک میں کوئی بڑا سائنس دان پیدا بھی ہوا ہے تو وہ اپنی ذاتی قابلیت کی بنا پر ہوا ہے، ورنہ ملک کا نظام تعلیم ایسا ہے کہ اس کی بنیاد پر یہاں کوئی قابل شخص پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر جو کچھ تعلیم ہے، اس کا معیار انتہائی پست ہے۔ اس کا سبب رٹے اور نقل کی بنیاد پر پاس کرنے کا وہ نظام ہے جس میں طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے بجائے ٹیوشن کے ذریعے سے ان کی صلاحیتوں کو مردہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ماسٹر ڈگری کے حامل کی قابلیت بھی مشکوک ہوتی ہے اور بیرونی ممالک میں ہمارے اعلیٰ جامعات کی ڈگریاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔

اس نظام میں اساتذہ کا معاملہ یہ ہے کہ جو لوگ قابل ہیں، ان کو کوئی حقیقی بدلہ نہیں ملتا اور وہ قابل رحم حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پھر جو لوگ اس شعبے میں آتے ہیں، وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو معاشرے میں کسی دوسرے کام کے لیے موزوں نہیں ہوتے۔ ملک کا کوئی ایک نظام تعلیم نہیں۔ ہمارا ملک غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس میں نصف درجن نظام تعلیم موجود ہیں۔ تعلیم کی زبان مادری، قومی یا سرکاری ہو، اس کا فیصلہ بھی نصف صدی میں نہیں ہو سکا۔ انگریزی پر عبور آج قابلیت کی واحد اساس ہے۔ پرائیویٹ شعبے کے لیے تعلیم صرف ایک کاروبار ہے جس میں بچوں کے وزن سے زیادہ بھاری بستے ان کی پیٹھوں پر لاد کر، ان کے والدین سے بھاری فیس وصول کر کے ایک نامانوس زبان میں انھیں ''علم'' دیا جاتا ہے۔

ذاتی مطالعہ جو شعور کی بلندی اور علم کے حصول کا سب سے مؤثر غیر رسمی طریقہ ہے، اس کا حال بھی انتہائی ناگفتہ ہے۔ چودہ کروڑ کی آبادی میں کسی مصنف کی کتاب پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور برسوں گزر جاتے ہیں، مگر دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی نوبت نہیں آتی۔ یہاں لوگ کسی بھی چیز کے لیے پیسے خرچ کر سکتے ہیں، مگر کتاب کے لیے نہیں۔ قوم کی اکثریت ذوق مطالعہ سے عاری ہے۔ خصوصاً الیکٹرونک میڈیا کے غلبے کے بعد تو قوم مطالعہ کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہوتی جا رہی ہے۔ نتیجتاً کتاب کی موت واقع ہو رہی ہے۔ کتاب کی موت علم کی موت ہوتی ہے اور علم کی موت قوم کی موت ہوتی ہے، مگر اس قوم کو کون یہ بات سمجھائے؟

ہماری اس علمی پس ماندگی کے نتائج صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں پیچھے رہ جانے کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہو رہے، بلکہ ہماری یہ اجتماعی جہالت دیگر میدانوں میں بھی ہمارے لیے شدید مسائل پیدا کر رہی ہے۔ آج جو تنگ نظری، تعصب اور عدم برداشت کا ہم شکار ہیں، اس کا سبب بھی ہماری علمی پس ماندگی ہے۔ علم و مطالعہ کی کمی کی بنا پر ہمارے ہاں لوگ صرف اپنا نقطۂ نظر جانتے ہیں۔ وہ اس بات سے واقف ہی نہیں ہوتے کہ یہاں کوئی دوسرا نقطۂ نظر بھی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ دوسروں کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کریں یا ان کی رائے کا وزن محسوس کریں۔ جن لوگوں کا واحد منبع علم کتاب کے

بجائے لفاظی وخطابت کی جادوگری ہو، وہ عقل کی دشمن جذباتیت کے اسیر نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا؟ علم وتحقیق کی روایت ہمارے ہاں ویسے بھی زیادہ روشن نہیں، مگر جتنی کچھ بھی ہے قوم کی جہالت اس کی آگہی سے اسے محروم رکھتی ہے۔

ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ حاصل ہو اور باصلاحیت لوگ سامنے آئیں۔ ہمارے نزدیک جب تک جہاد کی اسپرٹ کے ساتھ حکومت اور عوام اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کریں گے، ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا فروغ ممکن نہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی حوصلہ مند سرسید کی طرح سیاست کی پرخار وادی میں اترنے کے بجائے اپنی زندگی علم کے فروغ کے لیے وقف کر دے۔ نظام تعلیم کی اصلاح اور فروغ مطالعہ کے لیے جب تک مؤثر تحریکیں نہیں چلائی جائیں گی، اس وقت تک ہماری علمی پستی دور نہیں ہوگی۔

کوئی آبلہ پا...

اس تجزیہ کے آخر میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ ہم نے قوم کے دیگر مسائل سے پہلو تہی کیوں کی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا قومی وجود متعدد مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ مثلاً دولت کی غیر مساوی تقسیم، مختلف قومیتوں کے درمیان اعتماد کا مسئلہ، علاقائی عصبیت، ملک کے معاشی مسائل، مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ بندی وغیرہ، مگر ہمارے نزدیک سیاسی اور معاشی مسائل وقتی ہوتے ہیں جو اکثر کسی حکمران کی اچھی یا بری پالیسی سے بدلتے رہتے ہیں، جبکہ دیگر معاملات مثلاً انتہا پسندی اور جذباتیت وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو مرض سے زیادہ علامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ چیز ہمارے اس تجزیے سے واضح ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ قوم کے فاعل طبقات کی ذہن سازی کی جائے۔ جو لوگ قوم کی سیاسی، فکری اور مذہبی قیادت کر رہے ہیں اور جو ملک کے بیش تر وسائل اور مواقع پر قابض ہیں، جب تک ان کی صحیح تربیت نہیں ہوتی، کسی خیر کے پہنچنے کا امکان زیادہ روشن نہیں۔ خوش قسمتی سے عصر حاضر میں عوام الناس میں سے بہت بڑی تعداد قیادت اور اشرافیہ کی صفوں میں اپنی جگہ بنا رہی ہے۔ ان میں قومی درد مترفین کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ پھر جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا کہ قوم اپنی زندگی کے مرحلۂ شباب میں ہے جس میں قوم کے ہر طبقے میں زندہ اور دردمند افراد بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ چنانچہ اگر ایک معقول اور مدلل بات سامنے آئے گی تو یہ لوگ اسے آگے بڑھ کر قبول کریں گے اور اس کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ ایک روز یہ فروغ ایک فکری انقلاب میں تبدیل ہو جائے گا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہی فکری انقلاب قوموں کی ترقی کا ضامن ہوا کرتا ہے۔

ہم نے یہ کتاب تاریخ کے اسباق کی بنیاد پر لکھی ہے۔ وہ اسباق جو ہماری قوم کو یاد نہیں رہے۔ مگر یاددہانی کرانا ہی ہمارا کام ہے۔ یاددہانی نبیوں اور رسولوں کی سنت ہے۔ ہمارے لیے یہ ممکن تھا کہ اس کتاب کو صرف عروج وزوال کے قوانین کے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

بیان پر ختم کر دیتے۔ ہمیں وہ باتیں نہ کہنی پڑتیں جن کے بعد کہنے والے کا ایمان اور اسلام ہی بہت سے لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی قوم میں جہاں دنیا پرستی اور ذاتی مفاد نے ہر انسان کو بے حس بنا دیا ہو، جہاں اندھے راہ دکھانے والوں کا راج ہو، جہاں چونا پھری قبروں کا میلہ لگا ہو، جہاں مچھر چھانے جاتے اور اونٹ نگلے جاتے ہوں، وہاں خاموشی ہی میں عافیت ہے۔ ہم یہ عافیت ضرور حاصل کرتے اگر قیامت کا دن نہ آنا ہوتا۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ نہ دکھانا ہوتا۔ اگر ہمیں اپنے رب کے حضور لوٹ کر نہ جانا ہوتا۔

قلم ہمارا ہتھیار رہے۔ اسے تلوار بنا کر جو لکھنا تھا وہ لکھ دیا، اب نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام کے رب سے دعا ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادئ پر خار میں آوے

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تالیف: سینیٹر رابرٹ سی بائرڈ

<u>ترجمہ: کاشف علی خان شیروانی</u>

عراق پر حملہ

سچ ظاہر ہو کر رہے گا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس مضمون کے مصنف سینیٹر رابرٹ سی بائرڈ (Senatar Robert C Byrd) ۲۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو تارتھ کیرولینا، امریکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ابھی ایک سال ہی کی تھی کہ یتیم ہو گئے۔ ان کے چچا نے ان کی پرورش کا ذمہ لیا، مگر ہوش سنبھالنے کے بعد انھوں نے اپنے تعلیمی اخراجات خود اٹھا لیے۔ اس دوران میں کئی معمولی نوکریاں کیں۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی مرتبہ ویسٹ ورجینا ایوان نمائندگان میں رکن منتخب ہوئے۔ اس کے بعد تین مرتبہ امریکہ کے ایوان نمائندگان کے رکن منتخب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں West Virginia کی طرف سے امریکی سینٹ کے رکن بنے اور اس وقت سے لے کر آج تک رکن منتخب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔

اس عرصے میں وہ سینٹ کی کئی کمیٹیوں کے رکن رہے۔ ۱۲ سال تک ایوان میں 'Democratic Leade' رہے۔ ان میں سے چھ سال اکثریتی پارٹی کے قائد اور چھ سال حزب اختلاف کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۹۔۱۹۹۴ اور پھر ۲۰۰۱۔۲۰۰۲ تک ڈیموکریٹک پارٹی کی طرف سے صدارت کے تیسرے متبادل امیدوار کے طور پر نامزد ہوئے۔ مئی ۲۰۰۱ء میں انھیں اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ملا جب 'Virginia West' کے گورنر اور ایوان کی طرف سے ان کی خدمات کے صلے میں انھیں 'West Virginian of the 20th centrury' قرار دیا گیا۔

''سچ کو دبانے کی ہر کوشش عبث ہو گی۔ کیونکہ سچ ہمیشہ سے سربلند ہے۔ خدا کی ابدی بادشاہی اسی کے نام ہے اور غلط کاری بالآخر شکست کھاتی ہے۔ زخم خوردہ، تڑپتی ہوئی اپنے پجاریوں کے سامنے جان دے دیتی ہے۔''

آپ حقیقت کو مسخ کرنے کی لاکھ کوشش کیجیے۔ یہ خود کو منوا کر رہتی ہے۔ جھوٹ کچھ عرصے تک ہی اس پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ ہم انسان حقائق مسخ کرتے ہیں اور یوں اپنے ساتھیوں کو دھوکا دیتے ہیں، مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ جھوٹ اپنے پیچھے کئی خلا چھوڑ جاتا

ہے اور یہی خلا بالآخر سچ اگل دیتے ہیں، لیکن اصل ڈر اس کا ہے کہ ایک خاص مدت کے بعد شاید سچ کی کوئی اہمیت ہی نہ رہے اور جھوٹ اپنا نقصان پہنچا چکا ہو۔ صد افسوس کہ مروج جھوٹ کے ساتھ چلنا تو آسان ہوتا ہے مگر کڑوا سچ اگلنا بہت مشکل۔

ہم آج کل کی سیاست میں آئے روز یہ تماشا دیکھتے ہیں، مگر جس بڑے پیمانے پر یہ جھوٹ اس سینٹ میں بولا گیا ہے، اس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عراق صورت حال کے حوالے سے یہ سینیٹر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ امریکی عوام کی نظر میں اس حملے کو جائز ٹھہرانے کے لیے فریب کاری سے کام لیا گیا۔ اس پر ہماری حکومت نے مزید ظلم یہ ڈھایا کہ طویل عرصے سے متفقہ طور پر قابل قبول عالمی قوانین کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اس بات کا بین ثبوت موجود ہے کہ نہایت کاری گری سے ۱۱ ستمبر کے واقعات کا رخ اُسامہ بن لادن اور ''القاعدہ'' سے موڑ کر صدام حسین کی طرف کر دیا گیا جس کا ان واقعات کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ حملے سے کچھ عرصہ پہلے بش انتظامیہ نے ہمارے سامنے عراقی اسلحے کی نہایت خوف ناک تصویر کھینچی۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ عراق جوہری حملے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس نہ صرف جراثیمی ہتھیاروں کی پوری کھیپ موجود ہے۔ بلکہ پائیلٹ کے بغیر پرواز کرنے والے ایسے خود کار طیارے بھی ہیں جو ہمارے سے بڑے شہروں پر کسی بھی وقت جوہری حملہ کر سکتے ہیں۔ ان سب مبالغہ آمیز بیانات کا ماحصل یہ تھا کہ اس وقت ہماری آزادی کو لاحق سب سے بڑا خطرہ صدام حسین ہے۔ ابھی ۱۱ ستمبر کے واقعات کے زخم ہرے تھے۔ سو یہ شاطرانہ چال کامیاب رہی اور امریکی قوم کی طرف سے شدید ردعمل سامنے آیا۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف زدہ امریکی قوم کے جذبات سے کھیلنے کے مترادف تھا۔

یہ حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ جب سے جنگ ختم ہوئی ہے، بش انتظامیہ ہر اس نئے انکشاف کو نظر انداز کر رہی ہے جو ان کے بھیانک دعووں کی نفی کرتا ہے۔ جیسے ہی ان انکشافات پر بات ہوتی ہے، وائٹ ہاوس کے ترجمان گفتگو کا موضوع بدل دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ابھی تک برآمد نہیں ہوئے۔ اس پر جواب دیا جاتا ہے کہ عنقریب برآمد ہو جائیں گے۔ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو، مگر ہمارے انتہائی مہنگے اور تباہ کن حملے کی کیا وجہ جواز باقی رہ گئی ہے۔ وقت نے ہانس بلکس (Hans Blix) اور ان کی معاینہ ٹیم کے ان تمام دعووں کے درست ثابت کر دیا ہے جن کا بش انتظامیہ کبھی مضحکہ اڑایا کرتی تھی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں بلکس (Blix) نے ہمیشہ کہا ہے کہ اگر خطرناک ہتھیار موجود بھی ہیں تو ان کو تلاش کرنے کے لیے ایک طویل عرصہ چاہیے۔ اور ہتھیاروں کی تلاش تو ایک طرف رہی، ابھی تک اسامہ بن لادن کا کچھ پتا ہے نہ صدام حسین کا۔ بش انتظامیہ نے امریکی عوام اور باقی دنیا کو بار بار اس بات کا یقین دلایا تھا کہ اقوام عالم کو دہشت گردی سے بچانے کے لیے یہ حملہ ناگزیر ہے۔ اور اس کے لیے پوری دنیا میں یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ صدام حسین بھی دراصل اسامہ بن لادن ہی کا ایک روپ ہے۔ مگر افسوس کا مقام ہے کہ جنگ کے اختتام پر جو نتائج سامنے آئے ہیں، ان سے بالکل واضح ہو گیا ہے کہ ہمیں عراق سے کوئی فوری خطرہ نہیں تھا۔ برسوں سے لگی اقتصادی پابندی کا شکار یہ ملک تو ہمارے خلاف ایک جہاز اڑانے کی قوت بھی نہ رکھتا تھا۔ موت کے سوداگر وہ عراقی جہاز جن کے بارے میں ہم ایک عرصے سے سنتے آرہے

تھے، محض گتے اور رسی کے کھلونے نکلے۔ ان کے تو میزائل تک فرسودہ اور محدود فاصلے تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ عراقی فوجیں ہماری ٹیکنالوجی اور تربیت یافتہ افواج کے آگے چند دن بھی نہ ٹھہر سکیں۔

اب صورت حال ہے کہ ہمارے وفادار فوجی جوان نہایت جان فشانی سے وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی تلاش میں ہیں اور اطلاعات کے مطابق ملنے والی چیزوں میں کھاد، گھروں میں صفائی کے آلات، چند روایتی ہتھیار اور ایک زمین دوز موسمی تالاب شامل ہیں۔ آپ خود اندازہ لگائیے کہ ہماری افواج کا کس قدر غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بات اس سے بہت آگے جا چکی ہے کہ ہم بش انتظامیہ کو ان کے کیے پر شرمندہ کریں، بلکہ یہ ساری صورت حال سنجیدہ سوالوں کے جواب مانگتی ہے:

۱۔ ہماری افواج کو اتنے بڑے خطرے میں ڈالنے کی کیا وجہ تھی؟

۲۔ لاتعداد شہریوں کو ہلاکت سے دوچار کرنے کا کیا جواز تھا؟

۳۔ کیا امریکی عوام کو جان بوجھ کر گمراہ کیا گیا؟

ہمارے لیے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس سب کے باوجود ہمارے دعویٰ ہے کہ ''ہم نجات دہندہ ہیں''۔ حقائق اس دعوے کا ساتھ نہیں دیتے۔ درست ہے کہ ہم نے ایک ظالم اور مطلق العنان حکمران کو اقتدار سے علیحدہ کیا ہے، مگر غلامی سے نجات کا مطلب آزادی، حق خود ارادی اور عوام کے لیے بہتر زندگی کی ضمانت ہوا کرتا ہے، مگر موجود صورت حال میں تو لگتا ہے کہ ہم نے عراقی عوام کو آزادی سے کم و بیش دو سو سال پیچھے دھکیل دیا ہے۔ عوام کے لیے بہتر زندگی کی ضمانت کے تمام بلند و بانگ دعووں کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ عراق میں پانی مفقود ہے اور اگر کہیں دستیاب بھی ہے تو بدبودار اور گدلا۔ بجلی کبھی کبھار کی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ خوراک کی شدید قلت ہے۔ ہسپتال میں زخمی اور معذور افراد کا اژدہام ہے۔ تاریخی مقامات کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ عراقی عوام لوٹ مار کا شکار ہیں، جبکہ جوہری ہتھیاروں کا کچھ پتا نہیں اور امریکی افواج تیل کے کنووں کی حفاظت کر رہی ہے اور ساتھ تیل کی فراہمی بھی جاری ہے۔

عراق کی تعمیر نو

اس دوران میں عراق کی تعمیر نو کے تمام منفعت بخش ٹھیکے بغیر کسی بولی کے اپنے خاص دوستوں کو عطا کیے جا رہے ہیں اور امریکی حکومت نے اس سلسلے میں اقوام متحدہ کے تعاون کی ہر پیش کش ٹھکرا دی ہے۔ اب اگر پوری دنیا ہماری نیت پر شک کرے اور ہمارے اقدامات پر عدم اعتماد کا اظہار کرے تو اس میں حیرت کی آخر کیا بات ہے۔

اس منظر نامے میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ہم نے عراقی عوام کو حق خود ارادی سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اب یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ ''نجات دہندہ'' کے مسکراتے چہرے نے تیوری چڑھے فاتح کا روپ دھار لیا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امریکہ عراقی عوام کو آزادی کی نوید سنا رہا تھا اور آج عراقیوں کے سینے پر بندوق کی نالی ہے۔ حالات روز بروز بگڑ رہے ہیں اور حالات کا یہ بگاڑ عراقیوں کو مزید مشتعل کرنے کا باعث بنے گا۔ اب تک عراق میں حکومت کی تبدیلی کا مطلب ''لاقانونیت'' کے سوا کچھ نہیں اور غور فرمائیے کہ ایک قابض فوج اس لاقانونیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہاں کی امریکی انتظامیہ اس سوال پر مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہی ہے کہ وہ کتنے عرصے میں عراق چھوڑے گی۔ یاد رکھیے کہ جمہوریت اور آزدی کے اقدار طاقت کے زور پر رائج نہیں کی جاسکتیں۔ ایسا سوچنا بھی حماقت ہے۔ اس مرحلے پر ہر شخص کو رک کر سوچنا چاہیے کہ ہم اتنے سادہ لوح کیوں بن گئے ہیں۔ کیا ہم ایک ایسے ملک میں جو متعدد سیاسی، مذہبی اور قبائلی رقابتوں کا شکار ہے، امریکی تہذیب، اقدار اور طرز حکومت کا بیج بو سکتے ہیں؟ پھر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ وہاں کے تمام اہم گروہ امریکی عزائم کے بارمیں سخت شکوک وشبہات رکھتے ہیں۔ وہ فلسفۂ مادیت پر استوار مغربی طرز معیشت کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے۔

اس سے پہلے بھی کئی دانش ور امریکی حکومت کو متنبہ کر چکے ہیں کہ یہ پالیسی کم از کم ایک ہزار ایسے اسامہ بن لادن پیدا کرے گی جو ۱۱ ستمبر کے واقعات سے بھی بڑی مصیبت نازل کر سکتے ہیں۔ مگر ہم دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے کے بجائے مزید تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ابھی ہم نے افغانستان میں اپنے مقاصد پورے نہیں کیے تھے کہ عراق پر حملہ کر دیا۔

چنانچہ یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ القاعدہ نئے انتقامی جذبوں کے ساتھ لوٹ آئی ہے۔ امریکہ دوبارہ خطرے میں ہے۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ عدم استحکام کا شکار ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ وہ علاقہ ہے کہ جہاں کے سیاسی وسماجی حالات وعوام ہم آج تک سمجھ نہیں پائے۔ اس صورت حال کا ایک اور تکلیف دہ رخ یہ ہے کہ ہم نے دنیا میں اپنے دوستوں کو دھونس اور دھمکی کے ذریعے سے اپنی حمایت پر مجبور کیا۔ اس سلسلے میں سفارت (Diplomacy) اور استدلال کا طریقہ یک سر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کی جگہ ہم نے طاقت کا بے جا استعمال کیا۔ محض اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر یک رخی پالیسی بنائی اور جس ملک نے ہمارے اس فیصلے کے خلاف سر اٹھانے کی کوشش کی، وہ ہماری سخت تنقید کا نشانہ بنا۔ چنانچہ ہمارے نزدیک ہر وہ ملک راندۂ درگاہ ٹھیرا جس نے اس مہم میں ہمارا ساتھ دینے سے انکار کیا۔ ابھی پچھلے دنوں میں یہ پڑھ کر حیران رہ گیا کہ ہم نے اپنے دیرینہ دوست ترکی کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ یہ انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ہم ترک حکومت کو اس بات پر مسلسل دھمکا رہے ہیں کہ وہ اپنے آئین اور جمہوری اداروں کی توثیق سے فیصلہ نہ کرے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے اس طرز عمل سے دنیا میں ہتھیاروں کی ایک نئی دوڑ کا آغاز ہوگا۔ ہر ملک کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ وسیع پیمانے پر تباہی مچانے والے ہتھیار تیار کرے تاکہ امریکہ کے تباہ کن حملوں کا جواب دینے کے قابل ہو سکے۔ اس وقت دنیا میں ہر جگہ امریکہ کے بارے میں یہ تصور فروغ پا چکا ہے کہ امریکہ ہمہ وقت آمادۂ جنگ ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں کسی بھی جگہ اور کسی بھی وقت حملہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صدر کے ان اقدامات کو روکنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ کانگریس نے اس نازک

مرحلے پر جنگ کے فیصلہ کا اختیار صدر کو تفویض کر دیا اور آپ دیکھیے گا کہ یہ کانگریس کی تاریخ کا بدترین فیصلہ قرار پائے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ارکان کانگریس امریکی حکومت سے عراقی مسئلے کے بارے میں کوئی سوال پوچھنے سے مسلسل ہچکچا رہے ہیں۔ تاہم میرے لیے باعث اطمینان ہے کہ مختلف حلقوں سے بہرحال یہ سوال اٹھنے شروع ہو گئے ہیں کہ عراقی صورت حال پر قابو پانے کے لیے ابھی کتنا عرصہ درکار ہے؟ اور دوسری طرف حالت یہ ہے کہ حکومتی حلقے ابھی اس بحث میں پڑے ہوئے ہیں کہ عراق میں امن امان برقرار رکھنے کے لیے کتنی فوج درکار ہے۔

آخر سچ کیا ہے؟ ہمیں یہ قبضہ اور تعمیر نو کتنی مہنگی پڑے گی؟ کوئی بھی اس کا صاف جواب نہیں دیتا۔ کیا ہم اس ذمہ داری کو ایک لمبے عرصے تک اٹھا سکتے ہیں؟ کیا ہم اس قابل ہیں کہ دہشت گردی کا مقابلہ اس کے علاقے میں جا کر کریں؟ کیا ہم عراق میں صحت وصفائی کے بحران پر قابو پا سکتے ہیں؟ کیا ہم اتنے بھاری فوجی اخراجات برداشت کر سکتے ہیں؟ کیا ہم مزید لاکھوں ڈالر ادا کرنے کے قابل ہیں، جبکہ ہمارا بجٹ پہلے ہی ۳۴۰ بلین ڈالر خسارے کا ہے۔ اگر ٹیکس کٹوتی کا مجوزہ بل منظور ہو گیا تو یہی خسارہ ۴۰۰ بلین ڈالر تک جا پہنچے گا۔

ہم چپ چاپ تماشا دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف بغیر ہچکچاہٹ کے روز جھوٹ بولا جاتا ہے۔ ہم ایسے ناقابل اعتبار بیانات سن کر بھی چپ ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ اس موقع پر سچ قبول کرنا ہمیں مشکل لگتا ہے۔

میرے لیے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اس سب کے باوجود لاعلم نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ اس طرح کی سیاسی شعبدہ بازی اور ہیر پھیر کے عادی ہو چکے ہیں، مگر وہ یہ سب کچھ ایک حد تک ہی برداشت کریں گے، کیونکہ ہر جھوٹ کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہمارا انجام ابھی ہماری نظروں سے اوجھل ہے مگر ہمیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اور اس وقت امریکی خون بہے گا، شہری اندھے انتقام کا نشانہ بنیں گے اور ان میں معصوم مرد، عورتیں اور بچے، سب شامل ہوں گے۔ چنانچہ یہ غلط بیانی کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اس جھوٹ کی قیمت نہ تیل چکا سکتا ہے نہ انتقام۔ اس کا بدل انتخابات ہو سکتے ہیں اور نہ کسی شخص کا ''عالی شان نظریۂ جمہوریت''۔

اور حضرات! میری یہ بات لکھ رکھیے کہ مقتدر قوتیں وطاقت کے زور پر ایک عرصے تک ہی اپنے مخالفوں کو دبا سکتی ہیں، کیونکہ جیسا کہ ہوتا آیا ہے سچ بالآخر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اور پھر جھوٹ اور دھوکا دہی کے بل پر قائم تنکوں کے یہ محل ڈھے جاتے ہیں۔ [ماخوذ روزنامہ ''ڈان''، اشاعت ۲۴ مئی ۲۰۰۳]

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ کسب یا پیشہ نہیں ہے

کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ایک بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور اس سے اقتدار چھین کر اسے قید میں ڈال دیا۔قید کے دوران میں اس بادشاہ نے نئے حکمران سے درخواست کی کہ خواہ اسے کوئی سہولت نہ ملے، مگر بچوں کو پڑھانے کی اجازت مل جائے۔ نئے حکمران نے اس کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ میں نے بڑی مشکل سے تم سے ایک سلطنت چھینی ہے۔ میں اب ایک دوسری سلطنت تمھارے حوالے کیسے کر دوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک استاد کو اپنے شاگردوں پر کسی بادشاہ کی طرح اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ استاد کا اختیار بادشاہ سے بڑھ کر ہوتا ہے۔کیونکہ ایک بادشاہ کا دائرہ اقتدار صرف جسم تک ہوتا ہے، مگر استاد کی پہنچ تو دل، دماغ اور روح تک ہوتی ہے۔

ایک بچے کی دنیا بہت محدود ہوتی ہے۔ اس دنیا میں گھر کے بعد درس گاہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح والدین کے بعد وہ جن لوگوں کا اثر سب سے زیادہ قبول کرتا ہے، وہ اس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ جس طرح والدین بننا ایک پیشہ ورانہ کام نہیں، اسی طرح تعلیم دینا بھی کوئی پیشہ نہیں۔ تعلیم دینا اصل میں قوم کی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ تعلیم و تربیت تو نبوت کا خاصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مجھے استاد بنا کر بھیجا گیا ہے۔'' یہ حدیث بتاتی ہے کہ پڑھانا اور تعلیم دینا تو نبوت کے عظیم ترین خصائل میں سے ہے۔ جو لوگ دوسروں کو تعلیم دیتے ہیں، وہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی تکمیل کرتے ہیں۔ کسی شخص کی اس سے بڑی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کو آگے بڑھائے اور بلاشبہ ایک استاد اس عظیم منصب پر فائز ہوتا ہے۔

ایک استاد کا کردار فرد اور قوم، دونوں کی زندگی میں بڑا غیر معمولی ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کی زیر نگرانی گزارتا ہے۔ بچپن اور جوانی کا یہ حصہ بلاشبہ اس کی زندگی کا بہترین حصہ ہوتا ہے جس میں اس کی شخصیت پایۂ تکمیل

تک پہنچتی ہے۔اس کا ذہن ایک سادہ تختی کی مانند ہوتا ہے۔اساتذہ کے پاس دس پندرہ سال کا موقع ہوتا ہے کہ وہ جو چاہیں اس تختی پر لکھ ڈالیں۔ وہ چاہیں تو اس شخص کو ایک بہترین انسان بنا سکتے ہیں۔ وہ چاہیں تو معاشرے کو ایک دیانت دار، محنتی، بااخلاق اور باکردار شخص دے سکتے ہیں۔ تاہم ان کے لیے یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ اس خالی ذہن پر بدکرداری کی سیاہی مل دیں۔کوئی بھی استاد ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ایک استاد کسی طالب علم کو صرف اس وقت برا بناتا ہے جب وہ اس کے سامنے ایک برا کردار پیش کر دے۔ جب طلبا کے سامنے ایک غیر ذمہ دار، مفاد پرست اور بے کردار شخص استاد کے روپ میں آتا ہے تو اسے بچوں کو بگاڑنے کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اسے دیکھ کر اس کے طلبا خود بخود ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔

فرد کے ساتھ ساتھ قومی زندگی میں بھی اساتذہ کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔آج کل قوموں کا عروج و زوال اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ علم و ہنر میں کتنا آگے ہیں۔ یہ اساتذہ کی محنت اور توجہ ہوتی ہے جو کسی قوم میں اعلیٰ اذہان پیدا کرتی ہے۔ ہر بڑا سائنس دان، عالم، قائد اور عبقری (Genius) کبھی نہ کبھی ایک طالب علم رہا ہوتا ہے جہاں اس کا استاد وہ بنیاد رکھ دیتا ہے جس کی بنا پر ملک و قوم کو ایک مفید اور کارآمد شخص میسر آجاتا ہے۔

استاد بننا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ایک استاد اگر اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا اور دوسرے پیشوں کی طرح اسے صرف ایک پیشہ سمجھتا ہے تو گویا وہ سوسائٹی کی بنیادیں کھوکھلی کرتا ہے۔ایسا کرنے والے لوگ ایک روز خود بھی شدید نقصان اٹھاتے ہیں، کیونکہ انھیں رہنا اسی معاشرے میں ہے۔معاشرے کا نقصان آخر کار ان کا بھی نقصان ثابت ہوتا ہے۔

مختصر یہ اچھے اساتذہ حقیقی معنوں میں ملک و قوم اور مستقبل کے معمار ہوتے ہیں۔ یہ وہ خاموش مجاہد ہیں جن کی خدمات کا بدلہ اس دنیا میں دیا جانا ممکن نہیں۔ قیامت کے دن جب سب کچھ جاننے والا علیم و خبیر انصاف کے تخت پر بیٹھے گا تو جن لوگوں کو اس کی بارگاہ سے سب سے زیادہ رحمتیں اور درجات نصیب ہوں گے، ان میں سے ایک گروہ اساتذہ کا بھی ہوگا۔اس لیے کہ ہر کسی کا عمل اس کی ذات کے ساتھ ختم ہو گیا تھا، مگر استاد کا عمل نسل در نسل اور انسان در انسان بڑھتا چلا گیا۔

استاد بننا پیشہ نہیں ہے۔استاد بننا بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔استاد بننا ایک بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔

_____ ریحان احمد یوسفی

فہم انسانی کی فضیلت

جانوروں کا جہاں سے دل چاہتا ہے، کھا پی لیتے ہیں۔ کھیت کسی کا ہو، چر لیتے ہیں۔ پیشاب، پاخانہ کرنے میں انھیں

موقع ومحل کا لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی دوسری ضرورتیں بھی ایسے ہی پوری کر لیتے ہیں۔

دوسری طرف انسان ہر کام دیکھ بھال کر کرتا ہے۔ کھانے پینے، رفع حاجت اور زندگی کے دوسرے معمولات ایک قاعدے وضابطے کے مطابق انجام دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسے عقل اور سمجھ جیسی دولت عطا کی گئی ہے۔ پھر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان اپنی خواہش پوری کرنے میں جائز و ناجائز کا فرق بھلا دیتا ہے۔ دوسروں کا مال ہتھیانے اور ان کی عزت پر حملہ کرنے میں اس کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ جانوروں کی زندگی بھی ان خاص اصولوں اور رجحانات کے تابع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں راسخ کر دیے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقام و مرتبے پر قائم رہے یا اس سے گر کر حیوانی سطح پر آ جائے۔ جب تک انسان ہوش وحواس میں ہوتا ہے، اسے خبر ہوتی ہے کہ وہ انسانی شرف کا پاس کر رہا ہے یا اپنے مقام سے گر چکا ہے۔ لہٰذا عقل اور سمجھ ہی ایسی چیز ہے جو انسانوں اور جانوروں میں تفریق کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم راہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔'' (الاعراف ۷: ۱۷۹)

ہم پر لازم ہے کہ قدرت کے اس قیمتی عطیے ''سوجھ بوجھ'' کو کام میں لائیں۔ اگر کوئی بات خود سمجھ میں نہیں آتی تو ان لوگوں سے پوچھ لیں جو ہمیں زیادہ سمجھ دار اور عقل مند دکھائی دیتے ہیں۔

—— محمد وسیم اختر مفتی

انوکھی طرز کے انسان

ہم سب دنیا میں اچھی زندگی گزارنے کے لیے بہترین اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں، عمدہ نوکری اور اچھا بزنس تلاش کرتے ہیں۔ دنیوی آسایشیں پانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے اور ہر وہ کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں جس میں ذرا فائدہ نظر آتا ہو۔ ہر اس کام سے دور بھی رہتے ہیں جس میں فائدہ نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہمارے ہی اندر دوسری طرح کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ایسے کام کر گزرتے ہیں جن میں انھیں کوئی فوری نفع نہیں ملتا۔ یہ کام وہ کوئی خاص مقصد (Goal) پیش نظر

رکھ کر کرتے ہیں جو عموماً مادی نہیں ہوتا۔ اس طرح کے لوگ قلیل ہونے کے باوجود ہر قوم اور ہر مذہب میں ہوتے ہیں۔ یہ انوکھی طرز کے انسان دھن کے پکے اور لگن کے سچے ہوتے ہیں۔ انھیں خساروں سے محبت ہوتی ہے اور وہ جان جوکھوں میں ڈالنے کا شوق رکھتے ہیں۔

انسانوں کے طرز عمل میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ فائدہ وقتی ہوتا ہے اور دیرپا بھی پہلی طرح کے لوگ محض فوری فائدے کی جستجو کرتے ہیں جب کہ دوسرا طرز رکھنے والوں کی نگاہ ہمیشہ دیرپا نفع پر ہوتی ہے۔ وقتی اور پائدار کی یہ تقسیم دنیاوی کاموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جبکہ دنیا کے وقتی نفع کے مقابلے میں آخرت کی کامیابی کا دیرپا ہونا تو عیاں ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازماً آخرت کے اچھے انجام کو دنیاوی فائدوں پر ترجیح دینی چاہیے، لیکن دنیا میں چند روزہ زندگی گزارنے کے لیے دنیا کے کاموں میں مگن ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں کچھ کام اس طرح کے بھی کرنے چاہییں جن میں فوری فائدہ نہ ملتا ہو، بلکہ اعلیٰ اور دوررس مقاصد ہمارے پیش نظر ہوں۔

تعلیم پاتے وقت دنیا میں کام آنے والے فنون کے ساتھ وہ علوم بھی سیکھے جائیں جو انسان کی آخرت سنوارنے میں مدد دیں۔ مال کما کر اپنی آسایشوں پر خرچ کرنے کے ساتھ ان جگہوں پر بھی صرف کیا جائے جہاں ذاتی مفاد کے بجائے نوع انساں کا مجموعی فائدہ ہوتا ہو۔ اپنے بچوں کے ارمان پورے کرتے ہوئے ان بچوں کے سر پر ہاتھ بھی رکھا جائے جو سہولتوں سے محروم ہیں۔ اپنا گھر بناتے بے آسرا لوگوں کی چھت کا دھیان بھی رکھا جائے۔ ایک بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ غیر مسلم محض دنیا میں نام کمانے کے لیے ایسے کام کرتے ہیں اور مسلمان جنت میں اپنا گھر بنانے کی خاطر یہ نیکیاں کرتے ہیں۔ سورۂ دہر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ لوگ دنیا کی زندگی سے محبت رکھتے ہیں اور ایک سختی والے دن (روزِ قیامت) کو پس پشت ڈال دیتے ہیں''۔

ـــــ محمد وسیم اختر مفتی

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نعیم بلوچ

''تصویر کا مسئلہ''

مصنف: محمد رفیع مفتی،

ضخامت: ۹۶ صفحات،

قیمت: ۵۰ روپے،

ناشر: ادارہ علم و تحقیق المورد۔ ۵۱ کے ماڈل ٹاؤن لاہور،

ملنے کا پتا: ۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس بات پر سبھی اہل علم کا اتفاق ہے کہ دنیا کی تمام قدیم زبانوں کے حروف ابجد اشیا کی تصویروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ یہ بات بھی ایک طے شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں تحریر کے ساتھ ساتھ تصویر کسی نہ کسی شکل میں ذریعۂ ابلاغ رہی ہے۔ اور اس بات پر بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا کہ سائنسی علوم کی ترقی میں خاکوں اور تصویروں کا وہی کردار ہے جو ریاضی میں صفر کا ہے۔ پھر فنون لطیفہ میں مصوری کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تاریخ۔ انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں تصویر کے اس ناقابل انکار کردار کے علی الرغم اسلامی شریعت میں اسے عام طور پر حرام ہی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ماضی کے مسلمان سائنس دانوں کی طرح جب دور جدید کے تقاضوں نے عملاً، اس حکم کو ماننے پر اپنے عجز کا عملی اظہار کر دیا تو بعض اہل علم نے اس مسئلے کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے والے بعض علماء نے کیمرے کی تصویر کو حالات کا جبر قرار دے کر اہتاً جائز قرار دیا اور بعض نے اسے عکس ثابت کر کے حرمت کے دائرہ سے نکال کر عام مسلمانوں کی مشکل حل کر دی۔ لیکن اس سے نوعیت مسئلہ جوں کا توں رہی، یعنی کیا واقعی اسلام کے نزدیک اصلاً تصویر کا بنانا ایک اخلاقی یا عقیدے کی برائی ہے؟ کیا تصویر سے متعلق تمام فنون لطیفہ کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں؟ کیا سائنس و ٹیکنالوجی کی موجودہ ترقی اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، کیونکہ ایک حرام اور شیطانی فعل یعنی تصویر کو استعمال کیے بغیر حاصل ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ آخر ان احادیث کا کیا مطلب ہے جن میں جان دار اور بے جان کی تخصیص کیے بغیر علی الاطلاق ہر قسم کی تصویر حرام قرار دے دی گئی

ہے؟ زیر تبصرہ کتاب میں موضوع زیر بحث پر متذکرہ سوالات سمیت ہر قابل ذکر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف نے پہلے تصویر کے رائج نقطۂ نظر کا اس کے استدلال سمیت ذکر کیا ہے۔ احناف کی رائے کے لیے انھوں نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری سے علامہ بدرالدین عینی اور شافعی مسلک کا موقف پیش کرنے کے لیے امام نووی کی شرح مسلم سے اقتباس نقل کیے ہیں۔ ان آرا کا بنائے استدلال واضح کرتے ہوئے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ نقطۂ نظر احادیث اور قرآن کے تصور تماثیل سے معارض ہے۔ صحیح نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پہلے سورۂ سبا کی آیت ۱۳ اور سورۂ انبیا کی آیات ۵۲ تا ۵۴ میں قرآن کے تصور تماثیل کو متعین کیا ہے اور پھر تئیس (۲۳) احادیث کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے حرمت تصویر کی علت متعین کی ہے۔ تصاویر کے بارے میں فہم صحابہ پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے دو حدیثوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں بخاری کی وہ مشہور روایت بھی شامل ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک مصور کے پوچھنے پر اسے مصوری کے بارے میں فتویٰ دیا تھا اور یہی وہ روایت ہے جو ہمارے فقہا کے مسلک کی بنیاد بنی ہے۔ مصنف نے بادلائل ثابت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت سے وہ مطلب اخذ نہیں کیا جا سکتا ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اپنے موقف کے حق میں انھوں نے صحابہ کا عمل پیش کیا ہے۔ مصنف نے آٹھ مثالوں سے واضح کیا ہے کہ صحابہ کا عمل اس فہم سے مختلف ہے جو عام طور پر ان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد تابعین کا فہم اور عمل پیش کر کے انھوں نے اس بات کو مزید موکد کیا ہے کہ وہ بھی صرف انھی تصاویر و تماثیل کو ممنوع سمجھتے تھے جو مظہر شرک ہوں۔ صفحہ ۷۳ پر وہ اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہمارے خیال میں تصویر کے بارے میں مذہب کا موقف سمجھنے میں فقہا سے غلطی نہیں ہوئی، بلکہ ہمارے علما سے فقہا کا موقف سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔
>
> ہماری ساری تنقید دراصل فقہا کے موقف کی اس وضاحت پر ہے جو اس کو پیش کرنے والے علما کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اگر فقہا کی بیان کردہ، وہ عبارات جنھیں ہم نے مقالے کی ابتدا میں بیان کیا ہے، ان کا تجزیہ ان کے ظاہر الفاظ سے ہٹ کر کیا جائے، تو یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ فقہا کے ہاں دراصل، وہ موقف پایا ہی نہیں جاتا جو علما نے ان کی عبارات سے اخذ کیا ہے۔ فقہا کا اصل موقف کیا ہے؟ ہمارے خیال میں ان کا موقف بھی وہی ہے جسے ہم نے اپنی اس تحریر میں ثابت کیا ہے کہ صحابۂ کرام اور تابعین کا موقف ہے، یعنی یہ کہ دین میں صرف وہی تصاویر ممنوع ہیں جو مظہر شرک ہیں۔ البتہ مسئلہ یہ ہے کہ فقہا نے بھی اپنا یہ موقف انھی الفاظ میں بیان کیا ہے جن میں ابن عباس نے اپنے سائل کو یہ فتویٰ دیا تھا کہ تم بس بے جان چیزوں ہی کی تصاویر بنایا کرو، ان الفاظ کو اگر اسی فضا میں رکھ کر سمجھا جائے جس میں یہ بولے گئے تھے تو پھر ان سے ہمارے خیال میں فقہا کا صحیح موقف سامنے آتا ہے۔
>
> فقہا کا زمانہ صحابۂ کرام سے قریب تر تھا۔ اس میں تصویر کے بارے میں ابھی وہ فضا تبدیل نہیں ہوئی تھی، جس میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے سائل کو فتویٰ دیا تھا۔ وہ فضا کیا تھی؟ وہ فضا یہ تھی کہ تصویر کا اکثر استعمال شرک کی خدمت کے لیے ہوا کرتا تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تصویر میں عام طور پر روح کا اثبات کیا جاتا تھا۔ اس ماحول میں ابن عباس رضی اللہ عنہ نے

زندہ وجود کی تصویر ہی کو وہ تصویر قرار دیا جس کے بارے میں وہ مشرکانہ تصور کے پیدا ہونے کا امکان سمجھتے تھے، لہٰذا انھوں نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ اسی فضا میں فقہا نے تصاویر کے بارے میں اپنا موقف بیان کیا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے استعمال کردہ الفاظ کو اختیار کرتے ہوئے، انھوں نے بھی زندہ وجود ہی کی تصویر کو ممنوع قرار دے دیا، تاکہ وہ ان الفاظ سے ہر ممنوع تصویر کو حرام قرار دے دیں۔ ان کے بیان حرمت کے اس اصول سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اُس زندہ وجود ہی کی تصویر کو حرام قرار دے دیا جس تصویر میں روح کا وجود مانا جاتا تھا یا کل کلاں مانا جانا ممکن تھا کیونکہ اس روح ہی کی بنا پر اس کا مصور خدا کی نقالی کرنے والا شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ فقہا کے بارے میں یہ خیال درست ہے کہ انھوں نے بھی درحقیقت صرف انھی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے جو مظہر شرک ہیں۔'' (۷۳)

کتاب کے آخری حصے میں مصنف انسانی فطرت کے ساتھ اور دوسرے فنون لطیفہ کے تعلق کو زیر بحث لائے ہیں۔ انسانی نفسیات کا بڑے ادبی پیراے میں تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے تصویر سمیت تمام فنون لطیفہ کو انسان کے طبعی ذوق کا ظہور قرار دیا ہے اور اپنی اس رائے پر قرآن اور اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت پیش کی ہے۔

مصنف کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تصویر کا شرک کے ساتھ یہ تعلق ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور اسی وجہ سے احادث میں تصاویر کی اس قدر ممانعت آئی ہے، جبکہ موجودہ دور میں تصویر و مجسمے کا بالکل دوسرا استعمال ہے۔

بحث کو اس مقام پر پہنچا کر مصنف نے تصویر کے حوالے سے دین کا وہ موقف پیش کیا ہے جو ان کے نزدیک اسلام کا اصل منشا ہے۔ یہ رائے چونکہ عام نقطۂ نظر سے مختلف ہے، اس لیے مناسب یہی ہے کہ قارئین اسے مکمل دلائل کے ساتھ کتاب ہی میں ملاحظہ کریں۔

کتاب کا موضوع اس لحاظ سے بڑا نازک ہے کہ مصنف نے رائج اور کم وبیش متفقہ نقطۂ نظر سے مختلف رائے بیان کی ہے، لیکن طرزِ استدلال اس قدر متاثر کن ہے کہ کوئی بھی غیر متعصب قاری اسے ایک دقیع تحقیقی مقالہ قرار دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مصنف کے استدلال کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے احادیث کے انکار کی روش اپنانے کے بجائے اس کا صحیح مفہوم جاننے کی کوشش کی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے نہ انھوں نے الفاظ کے ہیر پھیر سے کام لیا ہے اور نہ منطقی موشگافیوں سے۔ وہ عقل عام کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سائنٹفک انداز میں اپنی بات منواتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مصنف کے اسلوب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ کئی جگہوں پر وہ تحریر کے بجائے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض مقامات پر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ بات واضح ہو چکی ہے، لیکن مصنف کا یہ خدشہ کہ شاید ابھی ابلاغ میں کوئی کمی ہے، غیر ضروری طوالت کا باعث بھی بنا ہے۔ مصنف نے کتاب میں موسیقی کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے ان کا قاری اسے مباح سمجھتا ہو، حالانکہ عام طور پر اسے بھی تصویر ہی کی طرح حرام کے درجے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ امید ہے اگلے ایڈیشن میں ان پہلوؤں کی طرف توجہ دی جائے گی۔ بے شک یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے دین کا ہر طالب علم پڑھے، سمجھے اور استدلال کی ایک نئی دنیا سے آشنائی حاصل کرے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مرزا آصف رسول

سورۂ تین

منظوم ترجمانی

رحیم و رحمان حق تعالیٰ کے اسمِ عالی سے ابتدا ہے
گواہی دیتا ہے ''تین''، یعنی وہ کوہِ جودی
اور اس کا دامن
کہ نوحِ پیغمبر خدا نے
خدا کا پیغامِ ارفعیت
ان اہلِ عدوان کو سنایا
جو ظلمتوں کی عمیق پستی میں سو رہے تھے
انھیں جگایا
مگر نہ جاگے وہ اہلِ غفلت
تو دیکھ لو اب
ہمیشہ کی نیند سو گئے ہیں
گواہی دیتا ہے کوہِ زیتون
جہاں سے حق نے
اس ابنِ مریم کو آسمان پر بلا لیا تھا
ستم کی دھرتی سے اپنی جانب اٹھا لیا تھا
کہ جس کے پیغامِ سرفرازی کو قومِ بد بخت نے نہ مانا
و قیر شے کو حقیر جانا
تو دیکھ لو پھر

یہود اپنی جفا کے بدلے میں اس امامت کو کھو چکے ہیں
عظیم نعمت گنوا چکے ہیں
جو طورِ سینا کی وادیوں سے
انھیں ملی تھی
وہ ساری دولت لٹا چکے ہیں
گواہی دیتا ہے طورِ سینا
جہاں پہ موسیٰ کے ساتھیوں کو
رفاقتوں کے صلے میں حق نے
کتاب و حکمت کا نور دے کر
انھیں امامت کی مرتبت پر
فراز و مامور کر دیا تھا
اور ان کی مستور منزلت کو
جہاں میں مشہور کر دیا تھا
دیارِ زمزم حریم قومِ رسول خاتم
کہ اجرِ مطلق ہے اس وفا کا
جو باپ بیٹے نے مل کے اپنے خدا سے کی تھی
بہ رجعتِ دل
اسی وفا کے نشاں کا حامل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ شہر مامون بھی ہے شاید
کہ ہم نے انساں کو اس کے مقصود اس کی غایت کے آئینے میں
اک ایسی تقویم پر اٹھایا
حسین بنایا
کہ اپنی تخلیق اور توازن کی ہر جہت میں
جمیل تر ہے
کریم و ارفع نفیس و اعلیٰ عظیم صورت جلیل تر ہے
مگر جب آئے
ذلیل ہونے رزیل بننے پہ ابن آدم
وفا سے منکر دغا کا خوگر
علو و عظمت کی سرفرازی سے بے نیازی کے طور سیکھے
تو پھر ہمارا بھی قاعدہ ہے
کہ اس کی ہستی کو بامِ رفعت سے پستیوں میں گرا کے چھوڑیں
وقار و عزت کے آسماں سے
زمین کی ذلت پہ لا کے چھوڑیں
یہی وطیرہ رہا ہے اپنا
کہ جو بھی اپنے مقامِ ارفع سے نیچے آیا
تو اس کو ہم نے
بہت ہی ادنیٰ بنا دیا ہے
ہر ایک حد سے گرا دیا ہے
اس ابتلا سے
کڑی سزا سے
خدا کے مومن ہی بچ سکے ہیں
خدا کے مسلم
وہ اہلِ ایماں جو مانتے ہیں
حقیقتوں کو
خدا اور اس کی رسالتوں کو
اور ان کا طرزِ عمل بھی ان کے یقین محکم کا آئینہ ہے
شعار تقویٰ و پارسائی
وطیرہ مخلوق کی بھلائی
یہ ان کی ہستی کا لازمہ ہے
تو ایسے احباب باصفا کو
جزا بھی ہم بے حساب دیں گے
ارم کی صورت سرور پیہم
جو ختم ہو گا نہ اور کبھی کم
انھیں یہ نعمت شتاب دیں گے
تو اے رسول! اب ذرا بتاؤ
ہمیں دکھاؤ
وہ چیز کیا ہے؟
جو روزِ محشر کے سلسلے میں
جزا سزا کے معاملے میں
تمھاری تکذیب کر رہی ہے
تو کیا وہ اللہ
ہر ایک حاکم سے فیصلوں میں سوا نہیں ہے؟
پھر اس کا اک ایک قولِ فیصل
گمانِ بد سے ورا نہیں ہے؟
تو کیا یہ اب بھی ہے غیر ممکن؟
کہ وہ قیامت بپا نہ کر دے
اور اپنی میزاں کے آئینے میں
وہ نیک و بد کو جدا نہ کر دے

———

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com